شاہ ولی اللہؒ

اور انکی سیاسی تحریک

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

سندھ ساگر اکادمی

شاہ ولی اللہ اور انکی
سیاسی تحریک

یعنی

حزب ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

ترتیب و تدوین

پروفیسر محمد سرور

سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سندھ ساگر اکادمی ○ لاہور

، کتاب مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

2008

محمد صدیق نے
حاجی محمد حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور
سے چھپوا کر شائع کی۔
[illegible] 200/ روپے

پیش لفظ

(اشاعت دوم)

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی تصنیف "شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک" کو اب دوسری بار شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب مذکور کی پہلی اشاعت خواص اور طبقۂ علماء کے لیے تھی۔ اس اشاعت میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے مطالب ایسے اسلوب اور زبان میں ادا ہوں کہ عام پڑھے لکھے اُردو داں حضرات بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔

اصل کتاب دو حصّوں پر مشتمل تھی۔ ایک تو کتاب کا متن تھا، جو حضرت مولانا سندھی نے خود اپنے قلم سے رقم فرمایا تھا۔ اور دوسرے مبسوط حواشی تھے جو مولانا نور الحق صاحب علوی پروفیسر اورئینٹل کالج لاہور نے مرتب کیے تھے۔ اشاعتِ اوّل میں کتاب کا متن اوپر تھا اور حواشی اس کے نیچے۔ بے شک متنِ کتاب کی اہمیت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہی اصل کتاب ہے۔ لیکن مولانا نور الحق صاحب نے حضرت مولانا سندھی سے استفادہ کر کے پھر خود اپنے عمیق مطالعہ، وسعتِ معلومات، تحقیق اور استقصاء سے حواشی کو اتنا مفید اور اہم بنا دیا تھا کہ متن کے بیانات امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان حواشی کے بغیر نامکمل اور ادھورے رہ جاتے۔ اس ضمن میں مولانا نور الحق علوی نے جو محنت فرمائی، اس کی وجہ سے اصل کتاب کی اہمیت اور افادیت بہت بڑھ گئی۔ اور حواشی کتاب کے مضمون سے کوئی زائد چیز نہیں رہے۔ بلکہ کتاب کے اصل مضمون کا ایک ضروری حصّہ بن گئے۔

اشاعتِ زیرِ نظر میں ایک تو کتاب کے متن اور حواشی کے مضمون کو ملا دیا گیا ہے۔ اور

دونوں کو حتی الوسع ایک دوسرے سے مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے جہاں کہیں کسی حاشیے کا مضمون اصل متن کے سلسلۂ بیان میں نہیں کھپ سکتا تھا، اسے یا تو نیچے حاشیے میں لکھ دیا گیا ہے۔ یا وہ کتاب کے آخر میں ضمیمہ جات کی شکل میں آگیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرا کام یہ کیا گیا کہ متن اور حواشی میں فارسی اور عربی کی جو عبارتیں تھیں، اور وہ کافی تعداد میں تھیں، ان کا راقم الحروف نے عام فہم اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ نیز کتاب کے مضامین کی ترتیب میں کچھ کچھ جو گنجلک تھی، اسے بھی زیر نظر اشاعت میں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں جہاں تک راقم الحروف سے ہو سکا، اور جس حد تک کہ موقع اور محل اجازت دیتے تھے، اس نے اصل کتاب (متن و حواشی دونوں) کی زبان اور اس کے پیرایہ بیان کو آسان کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ خیال ہے کہ اس کے بعد اس کتاب کا ہمارے متوسط طبقوں کے لئے بھی سمجھنا مشکل نہ رہے گا۔

اصل کتاب کے مطالب اور حواشی کے مضامین میں کہیں ردّ و بدل نہیں کیا گیا۔ اور اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ اشاعتِ اول میں جو بھی مضامین آچکے ہیں، اس اشاعت میں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ چھوٹے۔ ممکن ہے کتاب کا نقشِ ثانی ظاہری شکل و صورت میں نقشِ اوّل سے قدرے مختلف ہو۔ لیکن جہاں تک اس کے مطالب کا تعلق ہے، نقشِ ثانی بعینہ نقشِ اوّل کی شبیہ ہے۔

جنوری ۱۹۴۴ء

محمد سرور۔ بیت الحکمت، جامعہ نگر، دہلی

عرضِ مرتب[1]

اشاعتِ اوّل

کَمُسْتَبْضِعٍ تَمْراً اِلٰی اَرْضِ خَیْبَرا۔

زیرِ نظر مقالہ حضرت مولانا عمّ فیضہم نے خود اپنے قلم سے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو شروع کر کے ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو ختم کیا۔ مقالہ جدید حقائق کا مرقع ہونے کے علاوہ بھولی ہوئی تاریخ کا تذکرہ اور محرّف کردہ واقعات کی اصل تصویر ہے۔ اس سے اس میں اغلاق کا پیدا ہونا ضروری امر تھا۔ ساتھ ہی حضرت نے مقالے کو مختلف قطعات کی صورت میں قلمبند فرمایا۔ بنا بریں میں نے محسوس کیا کہ خود حضرت مولانا سے "سبقاً" پڑھ کر ہی اسے حل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت نے کمال شفقت سے مقالہ مذکورہ مجھے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۱ء سے پڑھانا شروع کیا جو تین مجلسوں میں ۲۶ اکتوبر کو ختم ہوا۔ مشکل اور مغلق مقامات پر جو کچھ آپ ارشاد فرماتے، میں ساتھ ساتھ قلمبند کرتا جاتا یا بعد ازاں حافظے سے کام لے کر صفحۂ قرطاس پر لے آتا۔ ایسے تمام مقامات پر میں نے حضرت کا حوالہ ضروری سمجھا۔ اس کے علاوہ حضرت کی کتاب "التمہید لائمۃ التجدید" سے میں نے ضروری اقتباسات جا بجا نقل کر کے اشکال کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ماسوا تاریخی مستندات سے بھی مناسب مقامات پر حوالے نقل کر کے واقعات کی توضیح کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر تکرار محسوس ہوگا۔ مگر حواشی میں ہونے کے علاوہ اس قسم کے فراموش شدہ حقائق و واقعات اور محرّف کردہ تاریخ میں تکرار گوارا کیا جا سکتا ہے، تاکہ تحریف کا پرانا داغ کسی صورت سے مٹ سکے۔

اس اہم کام میں جس قدر عجلت اور رواروی برتی گئی ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ اتنا بڑا علمی اور حکمت کا خزانہ اور وہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو شروع ہو کر ۱۱ نومبر کی صبح کو ختم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ مجھے اپنے ذاتی اور منصبی فرائض کے ادا کرنے سے بھی چارہ نہ تھا۔ زیادہ وقت ادھر صرف کرنا پڑتا تھا۔ ان حالات میں ان تمام کوتاہیوں کو

---

[1] حاشیہ

میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ جو ناظرین کرام کو مقالے کی ترتیب و تالیف میں نظر آئیں گی ؎

نہ گلم نہ برگِ سبزم، نہ درخت سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

ہذا ما الزم

محمد نور الحق العلوی
تاج پورہ ، لاہور

عرضِ حال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی ۔

امّا بعد ۱۹۱۵ء میں ہم کابل پہنچے ۔ چونکہ یہ سفر ہم نے حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے فیصلے کی تعمیل میں اختیار کیا تھا، اس لئے وہ تاریخ ہند کا ایک اہم واقعہ بن گیا ۔ غالباً ڈاکٹر سر اقبالؒ نے خضرِ راہ میں ہمارے ہی حضر و سفر کا ذکر کیا ہے ع

وہ حضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل

کابل میں سات برس رہ کر ہم نے اس مسئلے کے سمجھنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کی تاریخ کا آج کی دنیا سے کیا تعلق ہے ؟ ہمیں آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا کہ ہمارے ملک میں چند نفوسِ عالیہ حقیقت شناس تو ضرور موجود ہیں جنہوں نے فراستِ خداداد سے تاریخ کو صحیح طور پر سمجھ لیا ہے یا جنہوں نے یورپ میں رہ کر دنیا کے انقلاب کا مطالعہ کیا ہے ۔ ورنہ عام طور پر ہمارے مفکرین

ع ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کے مصداق ہیں ۔

اس کے بعد ہم نے یورپ پہنچ کر انقلابِ روس اور ٹرکی کے نتائج کا عمیق مطالعہ کیا تو ہمیں اضطراب کے اس سمندر میں جو سلطان عالمگیر کے بعد تاریخ ہند میں موجیں مار رہا تھا، روشنی کا ایک مینار نظر آیا ۔ اور وہ امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک تھی ۔ چنانچہ اس تحریک کے انقلابی اصول ہم نے مکہ معظمہ میں بیٹھ کر معین کیے ۔

بفضلہ تعالیٰ اس قدر وسعتِ فہم پیدا ہونے کے بعد ہم امام ولی اللہ کی تحریک کو کارل مارکس کے نظریات کے مقابلے میں دنیا کے لیے زیادہ مفید ثابت کر سکتے ہیں ۔ اس کے نتیجہ کے

طور پر جو انقلاب ہمارے دماغ میں پیدا ہوا، اس کا لازمی اثر ہے کہ ''واقعہ بالاکوٹ کے بعد جس قدر نئی تحریکیں ہندوستان میں پیدا ہوتی رہیں، ان میں سے کسی ایک کو بھی ہم صحیح نہیں مانتے۔''

اس وقت ہم اس اجتماعی تحریک کے ایک مختصر مقدمہ کا تعارف کرانا چاہتے ہیں، جس میں امام ولی اللہؒ سے شیخ الہندؒ تک اہم واقعات کا اشارۃً ذکر کر دیا ہے۔ اسے ''مقدمہ تاریخ حزب ولی اللہ'' (حزب ولی اللہ کی تاریخ کا مقدمہ) کہا جائے گا۔ امام ولی اللہؒ کی فلاسفی کی حقیقت جس طرح ہم سمجھے ہیں، اسے ہرگز سمجھا نہیں سکتے، جب تک اس تحریک کی تاریخ نہ پڑھا لیں۔ ہمارا یہ ''مقدمہ'' اس تاریخ کے لئے تمہید کا کام دے گا۔ اصل میں یہ کام یعنی وطنی تاریخ کی تحقیق ہمارے ذہین نوجوانوں کا ہے۔ اگر وہ اِدھر متوجہ ہوئے تو ہمارے اس فکر کی بنیاد پر ایک ''ہسٹاریکل لاج'' کھڑی کر دیں گے۔

حکیم الہند امام ولی اللہؒ نے ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ (۵ مئی ۱۷۳۱ء) سے دہلی کے مفاسد کو ختم کرنے کے لئے توکلاً علی اللہ اپنی ذمہ داری پر ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ غالباً اس سے پانچ سال پہلے وہ اس مطلب کے لئے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ۱۱۳۹ھ میں شروع کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

تاریخ ہند کا یہ عظیم الشان واقعہ انقلابِ فرانس سے ۵۸ سال پہلے ہوا۔ حکیم الہند امام ولی اللہؒ نے اپنا نصب العین متعین کیا۔ اپنے پروگرام کی تدوین کی۔ جمعیت مرکزیہ بنائی اور اس کی شاخیں ملک میں پھیلیں۔ اس طرح حزبِ ولی اللہ ایک مسلم پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس نے حکومت مؤقتہ (PROVISIONAL GOVERNMENT) بنائی۔ لیکن ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) بروز جمعہ بالاکوٹ کے معرکۂ شہادت میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اس صدی میں اس تحریک کے لئے تین امام ظاہر ہوئے اور ایک امارت منعقد ہوئی۔

۱۔ امام ولی اللہ ۱۷۳۱ء تا ۱۷۶۳ء

۲۔ امام عبد العزیز ۱۷۶۳ء تا ۱۸۲۴ء

۳۔ امام محمد اسحاق ۱۸۲۴ء تا ۱۸۴۶ء

حکومت موقتہ کے امیر شہید سید احمد ۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء

اِس سال اس تحریک کا پہلا دور پورا ہوا۔ اس دور میں حزب ولی اللہ میں ایک ایسا انسان بھی پیدا ہوا جو نہ امیر تھا نہ امام۔ لیکن اپنی مبارک زندگی اور شہادت سے اپنے جدّ امجد کی تحریک کو زندہ کر گیا۔ وہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید بن عبدالغنی بن ولی اللہ ہے۔

اس تحریک کا دوسرا دور امام محمد اسحاق نے ۱۸۳۱ء سے شروع کیا۔ آپ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے۔ اور ۱۸۴۶ء تک مکہ معظمہ میں۔ دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی تھے۔ اور ان کے بعد امیر امداد اللہ بارہ برس تک دہلی میں رہے، یعنی ۱۸۵۸ء تک۔ اور اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے۔

ہندوستان میں ان کے پہلے نائب مولانا محمد قاسم ۱۸۷۹ء تک۔ پھر مولانا رشید احمد ۱۹۰۵ء تک، اور ان کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن ۱۹۲۰ء تک اس تحریک کے سرپرست رہے۔

اس سال تحریک مذکور کا دوسرا دور ختم ہوا۔

تحریک کے تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا تھا۔

بیت الحکمت دہلی
۲۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء ہندی

عبیداللہ سندھی
”متی اضع العمامۃ تعرفونی“

فہرست مضامین

تعارف

حزب ولی اللہ کا پہلا دور

حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی

۱۔ شاہ ولی اللہ کی پیدائش
۲۔ سلطنت دہلی کی حالت
۳۔ شاہ صاحب کی طالب علمی اور مشغلۂ تدریس
۴۔ شاہ صاحب کا سفر حجاز
۵۔ مراجعتِ وطن اور مکمل اجتماعی انقلاب کا عزم
۶۔ شاہ صاحب کی تعلیمات کی عمومیت اور عالمگیریت
۷۔ شہر دہلی کی بین الاقوامی مرکزی حیثیت
۸۔ شاہ صاحب کی دعوت اور اس کے اصول

سراج الہند امام عبد العزیز

۱۔ شاہ عبد العزیز کی تعلیم و تربیت
۲۔ متوسط طبقوں میں ولی اللّٰہی امامت کا قیام
۳۔ حزب ولی اللّٰہی کی امامت کا قیام
۴۔ حزب ولی اللّٰہی کی مرکزی جمعیت کے ارکان
۵۔ شاہ عبد العزیز کی تعلیم و ارشاد کا اثر بیرونِ ہند میں

۶۔ ولی اللٰہی تحریک اور نجدی و یمنی تحریکیں

۷۔ امیر سید احمد شہید

۸۔ جہاد کی تیاریاں

الصدر الحمید امام محمد اسحاق

۱۔ شاہ محمد اسحاق کی حزب ولی اللہ کی صدارت

۲۔ سرحد پار حزب ولی اللہ کی حکومتِ مؤقتہ کا قیام

۳۔ حزب ولی اللہ کی مخالفت اور اس کے اسباب

۴۔ سکھوں اور پٹھانوں سے لڑائیاں

۵۔ امیر سید احمد اور شاہ محمد اسماعیل کی شہادت

حزب ولی اللہ کا دوسرا دَور

۱۔ ولی اللہ تحریک کا نیا دَور

۲۔ شاہ محمد اسحاق کی حجاز کی طرف ہجرت

۳۔ حزبِ دہلوی اور حزبِ صادق پوری

۴۔ سقوطِ دہلی اور مدرسۂ دیوبند کا قیام

۵۔ مدرسۂ دیوبند کے اصول و مقاصد

۶۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن

حزب ولی اللہ کا تیسرا دُور

۱۔ تیسرے دَور کے اساسی اصول اور پروگرام

ضمیمہ جات

۱- آصف جاہ

۲- مرزا مظہر جانجاناں

۳- اجتہاد

۴- شاہ صاحب کا الہامی خواب

۵- شاہ صاحب کی مستقل امامت

۶- مدرسہ شاہ ولی اللہ

۷- مولانا محمد اسحاق پھلتی

۸- مدرسہ نجیب آباد

۹- دائرۂ شاہ علم اللہ

۱۰- ملا محمد معین ٹھٹوی

۱۱- شاہ عبداللطیف بھٹائی رح

۱۲- معرکۂ پانی پت

۱۳- خروج مہدی کا طریقہ

۱۴- انسانیت کے چار بنیادی اخلاق

۱۵- کسریٰ و قیصر کا نظام

۱۶- امام عبدالعزیز کا خواب

۱۷- یلغار نادر شاہ

۱۸- میرادلس
۹- احمد شاہ ابدالی
۲۰- ہندوستان کے افغانی صوبے

۲۱- فقہ حنفی

۲۲- ہندوستان میں شیعی دعوت

۲۳- مولانا رفیع الدین

۲۴- شیخ خالد کردی

۲۵- شیخ محمد بن عبدالوہاب

۲۶- طریقۂ امام ولی اللہ
طریقہ محمد بن عبدالوہاب النجدی

۲۷- امام شوکانی

۲۸- امام ربانی مجدد الف ثانی رح

۲۹- سید احمد شہید کی تعلیم و تربیت

۳۰- ہیئت اجتماعیہ کے مدارج

۳۱- پنجاب کی سکھ حکومت

۳۲- مولانا محمد یعقوب دہلوی

۳۳- مولانا مملوک علی

۳۴- مولانا قطب الدین دہلوی

۳۵۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی
۳۶۔ تاسیسِ مدرسۂ دیوبند
۳۷۔ مولانا امداد اللہ
۳۸۔ مولانا محمد قاسم
۳۹۔ مولانا رشید احمد گنگوہی
۴۰۔ حزبِ صادق پوری
۴۱۔ مولانا احمد علی سہارن پوری
۴۲۔ مولانا شیخ محمد تھانوی
۴۳۔ مولانا محمود حسن

تعارف

محمد سرور

آج کل ہندوستان کی تاریخ کی نئی نئی تعبیریں ہو رہی ہیں۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ ہم سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں صرف انگریز مصنّفوں کی لکھی ہوئی ہندوستان کی تاریخیں پڑھتے تھے۔ یہ لوگ ظاہر ہے برطانوی عہد کو سراہتے اور ہندو اور مسلمان دونوں کے زمانوں کو بُرا کہتے تھے۔ موجودہ قومی تحریک شروع ہوئی تو "بھارت میں انگریزی راج" قابلِ نفرت قرار پایا اور ہندوستان کی تاریخ نئے ڈھنگ سے لکھی جانے لگی۔

ہندوستان کی موجودہ "قومی تحریک" کے ہراول بیشتر ہندو ہیں۔ شروع شروع میں اس تحریک کا سارا تار و پود بھی خالص ہندوانہ تھا۔ گو اصولاً یہ تحریک سارے ہندوستان کی تھی۔ لیکن عملاً کافی عرصہ تک یہ صرف ہندوؤں تک محدود رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اس "قومی تحریک" سے صرف بے تعلق ہی نہیں رہے بلکہ بڑی حد تک اس کی مخالفت بھی کرتے رہے۔ دوسری طرف ہندوؤں نے مسلمانوں کو بدیسی سمجھنا شروع کیا اور ہندوستانی تاریخ کا اسلامی عہد ان کی نظروں میں تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔ بنگال کی تقسیم کے خلاف ہندوؤں کی جدوجہد مہاراشٹر والوں کی تحریکِ آزادی اور بندے ماترم کے گیت کا کانگرس کے پلیٹ فارم سے گایا جانا، یہ سب اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں۔

یہ بات ان ہندو قوم پرستوں کے نقطۂ نظر سے ایک حد تک معقول بھی تھی۔ اگر انگریز کی حکومت جابرانہ ہے، اور اس کا ختم کرنا ہر ہندوستانی قوم پرور کا فرض ہے، تو مسلمان بادشاہوں کی حکومت ان کی نظر میں برطانوی حکومت سے کیا کم جابرانہ تھی۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ انگریز کو تو بُرا کہا جائے

اور مسلمان فرمانرواؤں کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ جن ہندو سرداروں نے مسلمان بادشاہوں کے خلاف بغاوتیں لیں، وہ ان کے نزدیک بڑے وطن پرست قرار دیے گئے۔ سیواجی، گورو گوبند سنگھ آزادی کے سورما بنے۔ اورنگ زیب غاصب اور مستبد۔ اب مسلمان کیا کرتے۔ وہ لاکھ قوم پرست ہوں لیکن وہ اسلامی عہد اور مسلمان بادشاہوں کو برا کہہ کر نہ اپنا وجود قائم رکھ سکتے تھے اور نہ اپنی قوم کا وقار۔ الغرض ہندوستان کی تاریخ کا یہ مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی بہت بڑی خلیج ہے جس کا پاٹنا اس وقت مشکل نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات صاف ظاہر ہے کہ اورنگ زیب اور دوسرے مسلمان حکمران بادشاہی نظام کے محافظ تھے اور سامراج ہی اس عہد کا شعار تھا۔ سیواجی اور گورو گوبند سنگھ کچھ بھی ہو، عام ہندو رعیت کے نمائندے تھے۔ ان کی تحریک بے شک ہندو عوام کی تحریک تھی۔ یعنی مقابلہ ہندو عوام کا اور مسلمان بادشاہ کا تھا۔ اس زمانے میں جبکہ جمہوریت اور ڈیموکریسی ہر شخص کا مذہب بن رہا ہے۔ اور "شہنشاہیت اور استبداد کی بربادی" کے نعرے ہر جگہ گونج رہے ہیں، مرہٹوں، راجپوتوں سکھوں اور جاٹوں کی تحریک کو اس لحاظ سے برا کہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن کسی مسلمان کی زبان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف بھی آخر کیسے کھلے؟ اب دقت یہ ہے کہ ہندو قوم پرست جس عہد کو اپنی آزادی کی تحریک کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں اور اس کے لیڈروں کو اپنا پیشوا اور گورو، ہم اس کے برعکس اورنگ زیب کو بڑا خدا پرست بادشاہ مانتے ہیں اور اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو برا کہتے ہیں۔ چنانچہ اس بنا پر مسلمان وطن دوست اور آزادیٔ ملک کے لئے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے والے عجیب کشمکش میں گرفتار ہیں۔

مثال کے طور پر مولانا محمد علی مرحوم کو لیجیے۔ مرحوم شروع میں ہندوستان کی اس "قومی تحریک" سے بالکل الگ رہے تھے۔ ریاست بڑودہ کی ملازمت کے زمانے میں وہ اورنگ زیب عالمگیر کی حمایت اور سیواجی کی مخالفت کے سلسلے میں اپنے ہندو افسر کے معتوب بھی ہو چکے تھے۔ سنہ 1919ء میں جب مرحوم نے کانگرس میں شرکت کی تو اس وقت تک مسلمانوں کے کانگرسی تحریک

سے علیحدہ رہنے کے لئے ان کو وجہ جواز ڈھونڈنے کی ضرورت پڑی، چنانچہ مرحوم نے اپنے خطبہ میں جو انہوں نے کانگرس کے صدر کی حیثیت میں کوکناڈا میں پڑھا تھا، نہایت تفصیل سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں کا شروع میں سیاست کے شجرِ ممنوعہ سے الگ رہنا بجا اور درست تھا۔ لیکن جب علی گڑھ کے قیام اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی عام اشاعت پر کافی عرصہ گزر چکا اور ان میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں ہو چلے تو پھر مسلمانوں کے لئے کانگرس میں شریک ہونا ضروری ہو گیا۔ یعنی دوسرے لفظوں میں مرحوم نے یہ مان لیا کہ آزادی کی موجودہ تحریک میں مسلمان بعد میں آئے اور اس طرح اولیت کا سہرا ہندوؤں کے سر رہا۔ اس طرح گاندھی جی قائد بنے اور محمد علی اور شوکت علی اُن کے رفیق اور پیرو۔

مولانا مرحوم کو طبیعتاً یہ ثانوی حیثیت گوارا نہ تھی۔ اس لئے ان کی ہندو کانگرسی زعماء سے کبھی نہ بنی۔ خود گاندھی جی سے بھی جن کے وہ کسی زمانے میں بڑے عقیدت مند تھے، انہیں آخر لڑائی لڑنا ہی پڑی۔ یہ اختلاف عارضی اور وقتی اسباب کی وجہ سے نہ تھا، جیسا کہ اس وقت لوگوں نے سمجھا۔ یہ تصادم تھا دو مختلف ذہنیتوں کا — ہندو قوم پرست ہندوستان کی "قومی تحریک" کی قیادت کا دعویدار تھا۔ وہ مسلمانوں کو صرف اپنا یار و مددگار سمجھتا تھا۔ لیکن یہ کہ دونوں اس تحریک میں برابر کے ساجھی ہوں، یہ خیال گاندھی جی کی اساسِ فکر میں کبھی ممکن نہیں۔ "گاندھی ازم" آزاد ہندوستان کا سیاسی اور وطنی مسلک بننے کا مدعی ہے۔ گو مسلمان کی اس میں گنجائش ہے، لیکن محض مخلص پیرو کی حیثیت سے۔ ہندوستان کی قومی تاریخ کی اس تعبیر کا اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں نکل سکتا کہ مجبوراً جو مسلمان ان حالات میں کانگرس میں جائے گا، مسلمان اسے "خارجی" قرار دیں گے۔ اِن دنوں عام مسلمانوں کی کانگرس کی موجودہ قیادت سے بیزاری کا اصل سبب بھی حقیقت میں یہی ہے۔ گاندھی جی نے "قومی وطن" اور "قومی سیاست" کا جو تصور اہلِ ملک کو دیا ہے ہندوستان کا مسلمان اس میں اپنے لئے باعزت جگہ نہیں پاتا۔ اس لئے وہ گاندھی جی کی قیادت کو مانتا ہے اور نہ کانگرس کو اپنی قومی جماعت سمجھتا ہے۔

پیشِ نظر کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے مصنّف مولانا عبید اللہ صاحب سندھی ہندوستان کی تاریخ کی ایک نئی تعبیر پیش کرتے ہیں۔ اس تعبیر کی رُو سے ہر فرد، ہر گروہ اور ہر ملّت اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے کُل ہندوستان کا جزو بن سکتی ہے۔ مولانا کے ہندوستان میں محمد بن قاسم کی بھی جگہ ہے اور سیوا جی اور گورو گوبند سنگھ کی بھی۔ اس فکر کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں[1]۔ البتہ مولانا نے پیشِ نظر کتاب میں اِس ہندوستان کے ایک دَور کا تعارف کرایا ہے۔ ہندوستان کے اکثر مورّخ اس دَور سے بالکل ناواقف ہیں۔ ہندو مصنفین تک تو اس کی بھنک نہیں پہنچی۔ مسلمان اہلِ قلم بھی اس سے قطعاً بے خبر رہے۔ یہ دَور ہندوستان کے کسی فاتح اور کشور کشا مسلمان شہنشاہ کا نہیں۔ نہ یہ کسی سپہ سالار کا دَور ہے۔ اس دَور کی ابتدا ایک درویش صوفی سے ہوتی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی سلطنت اپنے پورے عروج پر ہے۔ سلطنت کی حدود ملک کی انتہائی وسعتوں تک پھیل چکی ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیری سلطنت کی شان و شوکت ابد الآباد تک رہے گی۔ لیکن یہ درویش اس سلطنت کے روگوں سے واقف ہے۔ وُہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ بادشاہ بڑا خدا پرست اور انصاف پرور ہے لیکن اس کے باوجود اس کی سلطنت میں بعض خدا کے بندے محض اس لیے معتوب ہیں کہ وُہ ہندو ہیں یا شیعہ۔ اس کا دل اس بات سے کُڑھتا ہے۔ وُہ سوچتا ہے کہ کس طرح اس ملک میں سب مہر و محبّت سے رہیں۔ وُہ سوچتا ہے لیکن کچھ کر نہیں پاتا۔ سلطنت کا شباب ہے۔ جوانی کے نشہ میں احتیاط کی باتیں کون سنتا ہے؟ یہ درویش شاہ عبد الرحیم ہیں۔ ان کے صاحبزادہ شاہ ولی اللہ اپنے والدِ محترم کے نقشِ قدم پر چل کر ہندوستان کی سوسائٹی کے لیے ایک ہمہ گیر، صالح اور مفید اساس وضع کرتے ہیں۔ اس اساس کی ظاہری صورت شکل "اسلامی" ہے لیکن اپنے جوہرِ اصلی میں یہ ایسا فکر ہے جو تمام انسانوں میں مشترک ہے۔ بے شک اس فکر کی بنیادوں پر جو سیاسی اور اجتماعی نظام بنتا، وُہ اکبرِ اعظم اور اورنگ زیب دونوں کے ہندوستان

---

[1] "مولانا عبید اللہ، حالات، تعلیمات، اور سیاسی افکار" میں تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

کو ترقی کے راستہ پر ایک قدم اور آگے لے جا سکتا تھا۔

شاہ ولی اللہ اس فکر کے موسس ہیں۔ ان کے جانشینوں نے اپنی ایک جماعت بھی بنائی۔ اس زمانے میں ہندوستان میں بڑی گڑبڑ تھی۔ نئی نئی قومیں اور جماعتیں اپنے اپنے اقتدار کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ شاہ ولی اللہ کی جماعت کو بھی اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑی۔ اس جدوجہد نے کئی شکلیں اختیار کیں، لیکن اس جماعت کا اصل اصول بدستور اپنی اصلی حالت میں رہا اور اس میں کوئی کمی زیادتی نہیں ہوئی۔ شاہ عبدالرحیم دربار کے علماء میں سے نہ تھے۔ ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ بھی درباری سیاست سے الگ ہی رہے۔ جس سال عالمگیر کے تخت پر سلطان محمد شاہ متمکن ہوا، شاہ ولی اللہ اپنے باپ کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ ۱۷۱۹ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی اور عام پڑھے لکھے مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ شاہ ولی اللہ کا مشن عام مسلمانوں کے لئے تھا، اس لئے سب سے پہلے انہوں نے قرآن مجید کا عوام مسلمانوں کی زبان میں ترجمہ کرنا ضروری سمجھا۔ شاہ ولی اللہ کے جانشین ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز ہوئے جو ۱۷۶۳ء سے ۱۸۲۴ء تک دہلی میں درس دیتے رہے۔ ان کے زمانے میں فارسی کی جگہ اردو لے رہی تھی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز کے بھائی شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا اور ان کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل نے اردو میں اور دینی کتابیں لکھیں۔ یعنی اس تحریک نے مسلمانوں کے حکمران طبقوں کو اپنا محور نہیں بنایا۔ یہ عوام مسلمانوں کو اپنا پیغام سنانا چاہتی تھی اور انہیں کی تنظیم اور جماعت بندی پر اپنے کام کی بنیاد رکھنی ضروری سمجھتی تھی۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ قیصر و کسریٰ کی سی خرابیاں مغلوں کی سلطنت میں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس لئے مصلحت خداوندی یہی ہے کہ اس نظام کو سرے سے توڑ دیا جائے۔ الغرض شاہ ولی اللہ کی تحریک مغلوں کی گرتی ہوئی شاہی عمارت کو تھامنے نہیں اٹھی تھی۔ وہ تو بادشاہی نظام کو فرسودہ اور بے کار ہوتا دیکھ رہے تھے۔ اس کے

پنپنے اور باقی رہنے سے وُہ مطلق نااُمید تھے۔ دراصل ان کی تحریک کا دارومدار عام مسلمانوں پر تھا۔ وُہ ان کے زوال آمادہ اونچے طبقوں کے بجائے عوام کو ہندوستان کی بادشاہت حاصل کرنے کی دعوت دینی چاہتے تھے۔ شاہ صاحب چاہتے تھے کہ بداخلاق اور نااہل بادشاہوں اور امیروں کی جگہ عوام مسلمان لیں۔ چنانچہ وُہ اور ان کے جانشین شاہ عبدالعزیز سالہاسال تک ان عوام کی تعلیم وتربیت میں لگے رہے۔ ان کی کتابوں، رسالوں اور وعظ وتدریس کا حاصل یہ تھا کہ سلطنت نواب ہاتھ سے جارہی ہے۔ اس کے ساتھ بادشاہ، امیر اور وزیر بھی جائیں گے۔ اب تک نظام سلطنت ان کے بل پر چلتا تھا۔ اب اگر عام مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنا ہے اور جن اعلیٰ افکار اور بلند مقاصد کو اچھے مسلمان فرمانروا اور خداپرست صوفی ہندوستان میں قائم رکھے ہوئے تھے۔ اگر انہیں برابر جاری رکھنا ہے تو اس کے لیے کسی اور اساس کی ضرورت ہے، جس پہ ہندوستان کی نئی سوسائٹی کی بنیاد رکھی جاسکے۔

شاہ ولی اللہ نے اس نئے ہندوستان کا تصوّر پیش کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے اس تصوّر کو عام مسلمانوں کے لیے عام فہم بنایا۔ اور ان کی زبان اور ان کے طور طریقوں پر اس تصوّر کی تلقین کی۔ شاہ اسمٰعیل اور سید احمد شہید نے اس تصوّر کے مطابق اپنی ایک جماعت بنائی اور اس جماعت کو لے کر وہ میدان عمل میں اترے۔ نتیجہ جو کچھ بھی ہوا۔ اور یہ تحریک اُس وقت جو کچھ کرنا چاہتی تھی، نہ کرسکی۔ لیکن اس کے اثرات فنا نہ ہوسکے۔ کسی کوشش کے ناکام ہوجانے سے وُہ روح جو اس کوشش کا باعث ہوتی ہے، بے کار تو نہیں ہوجاتی۔ یہ روح اندر ہی اندر اپنا کام کرتی ہے۔ حالات سازگار نہیں ہوتے تو یہ روح ظاہر میں اپنے اصلی رنگ میں نہیں آتی۔ اس کے لیے کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی یہ کوئی شکل اختیار کرتی ہیں اور کبھی دوسری شکل۔ ان الگ الگ شکلوں سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ سب کوششیں الگ الگ تھیں اور ایک دوسرے سے بے تعلق۔ لیکن سمجھ دار اس کثرت میں ایک ہی وحدت پاتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کا یہ کہنا کہ مسلمانوں کی موجودہ بیداری کی تحریک سرسید کے تعلیمی مشن اور محمد علی کی سیاسی جدوجہد سے شروع نہیں ہوئی۔ گو یہ بات انگریزی پڑھے ہوئے

طبقوں کے لئے بہت حد تک ٹھیک ہے لیکن عام مسلمانوں کی بیداری کی تحریک کا سرچشمہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات، شاہ عبدالعزیز کے وعظ و ارشاد اور شاہ اسمٰعیل اور سید احمد شہید کے جہاد سے پھوٹتا ہے۔ بدقسمتی سے موجودہ حکومت میں مسلمان انگریزی پڑھے ہوئے طبقوں کو بڑا عروج حاصل ہے۔ ان ہی کی باتیں ہر جگہ سنی جاتی ہیں۔ اخبار، کالج اور سیاسی انجمنیں سب انہی کی ہیں۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں، اس کا ہر جگہ چرچا ہو جاتا ہے۔ ان کے خلاف شاہ ولی اللہ کا نام لینے والے خود شاہ صاحب کے مقصودِ اعلیٰ سے ہٹ گئے ہیں۔ دوسرے زمانے کی زبان انگریزی اور اردو ہے اور شاہ صاحب کی تعلیمات تمام کی تمام فارسی اور عربی میں ہیں۔ ضرورت تھی کہ شاہ صاحب کے ماننے والے ان کی باتیں اس زمانے کے رنگ میں پیش کرتے، لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ خود اپنی آنکھیں بند کئے دوسری دنیا میں رہتے ہیں اور اس زمانے کی ان کو زیادہ خبر نہیں۔

یہ اسباب ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی سیاست، اجتماع اور اب تو مذہب کو بھی انگریزی پڑھے ہوئے طبقوں کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ بیشتر متوسط اونچے طبقوں کے لوگ ہیں۔ اور اگر ان میں سے پیدائشی طور پر کوئی نچلے طبقے سے ہے بھی، تو اس کی زندگی کا بھی سارا مقصد یہ ہے کہ اس کا شمار بھی اونچے طبقوں میں ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کی جماعت کے کام مسلمان کے ہاتھوں میں آنے نہیں پاتے۔ قیادت کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے، جو انگریزی عہد کی پیداوار ہیں اور ان کا تمام تر سرمایۂ فکر دوسروں کا دیا ہوا ہے۔ مولانا سندھی مسلمانوں کی قومی جدوجہد کی تاریخ سرسید، مولانا محمد علی یا مسلم لیگ سے شروع کرنا غلط سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ سب کڑیاں شاہ ولی اللہ کی تحریک کے سلسلے کی ہیں اور یہ کہ قومی بیداری کی ابتداء سرسید یا مولانا محمد علی سے ہوئی ٹھیک نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاہ ولی اللہ کی تحریک مرہٹوں اور سکھوں کی طرح ایک خاص مذہبی فرقے کی تحریک... نہ تھی؟ اگر گورو گوبند سنگھ نے سکھوں کو ابھارا اور انہیں ایک قوم بنا کر مسلمان بادشاہوں سے جنگیں کیں۔ اور سیواجی اور پیشواؤں نے مرہٹوں کو منظم کرکے سارے ہندوستان

پر اقتدار جمانے کی کوشش کی، تو کیا اسی طرح شاہ ولی اللہ اور اُن کے جانشینوں نے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ تنظیم نہیں کی۔ اگر واقعہ یہی ہے تو مرہٹوں اور سکھوں کی طرح شاہ ولی اللہ کی بھی ایک تحریک ہے جس کا کام صرف عام مسلمانوں کو اٹھانا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس خیال کو صحیح مان لیں تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف تو بدستور موجود رہا۔ مانا کہ عام ہندوؤں اور مطلق العنان مسلمان بادشاہوں کے جھگڑے ہماری تاریخ کا اہم باب نہیں لیکن اگر ہم اپنی قومی بیداری کی ابتداء شاہ ولی اللہ سے کرتے ہیں اور ہندو سیواجی اور گورو گوبند سنگھ کو اپنے قومی "ہیروز" شمار کرتے ہیں تو آپس کی شکر رنجی تو برابر قائم رہی اور اس نقطۂ نظر سے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں مل جل کر رہنے اور سیاسی کام کرنے کی کوئی صورت نہ نکلی۔

بظاہر اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ تاریخ کے واقعات کچھ اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کا نام لینے والی جماعت ایک متعصب، تنگ خیال اور جنگجو مذہبی گروہ نظر آتا ہے۔ لیکن اگر اس مسئلے کی پوری چھان بین کی جائے تو حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ملک چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں میں بٹ گیا تھا اور ان میں برابر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس خانہ جنگی کی وجہ سے ملک میں کوئی مرکزی حکومت بنتے نہ پاتی تھی۔ اس بنا پر باہر کی دنیا میں بھی اس ملک کی کوئی ساکھ نہ تھی۔ مسلمان بادشاہوں نے ان دونوں باتوں کا تدارک کیا۔ آخر کار اکبر اعظم کے عہدِ حکومت میں مسلمان بادشاہوں کی برسوں کی کوششیں کمال کو پہنچیں اور کابل سے لے کر دکن تک ہندوستان کی ساری قلمرو ایک بادشاہ، ایک قانون اور ایک سیاسی نظام کے ماتحت متحد ہو گئی۔ اور ایشیا کے ملکوں میں ہندوستان کا نام عزت سے لیا جانے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے بعد دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہو گئی۔ سلطنت کے حصے بخرے ہوتے چلے گئے اور مرکزی حکومت کا ضعف رُکتا نظر نہ آتا تھا چنانچہ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں، نوابانِ اودھ اور روہیلوں کی بغاوتیں اس کا لازمی نتیجہ تھیں۔ لیکن ہماری تاریخ کا یہ قدم ترقی کی طرف نہیں اٹھا تھا بلکہ کم و بیش چھ سو برس کی مسلمان بادشاہوں کی جدوجہد کا جو حاصل تھا وہ

افراتفری میں ختم ہو رہا تھا۔ یعنی ہندوستان کی مرکزیت ان تحریکوں کی وجہ سے فنا ہو رہی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے لامرکزیت کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے ایک نیا دستورِ حیات پیش کیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب اکبر اعظم کے ہندوستان کے بہت حد تک قائل نظر آتے ہیں۔ ایسا ہندوستان جس کا ایک قانون تھا۔ اس قانون کی نظر میں سارے ہندوستانی برابر تھے نہ ہندو اس کے نزدیک کمتر تھے اور نہ مسلمان برتر تھے۔ انصاف اس قانون کا اصل اصول تھا اور مذہبی رواداری اس کا امتیازِ خاص۔ بادشاہ سب کا بادشاہ تھا، کُل ہندوستان کا بادشاہ۔ وہ محض مغلوں کا بادشاہ نہ تھا اور نہ وہ صرف مسلمانوں کا بادشاہ تھا۔ وہ کُل ہندوستان میں بسنے والی مخلوق کا فرمانروا تھا۔ شاہ ولی اللہ عقیدۂ وحدت الوجود کو مانتے تھے اور کثرت میں وحدت پر ان کا ایمان تھا۔ اس لیے وہ ایسے ہندوستان کا تصور کر سکے جو آزاد، خود مختار وحدتوں میں منقسم ہو اور بالجملہ ایک ہو۔ شاہ صاحب کا یہ فکر اتنا ہمہ گیر ہے کہ وہ صرف ہندوستان کی نہیں بلکہ ساری کائنات کی نہایت معقول اور فائدہ بخش تفسیر کرتا ہے۔ ان کی تصنیفات جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی گئیں۔ سب اسی نظام کی شرح کرتی ہیں۔

اس بیان سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شاہ صاحب اکبر اعظم کے سامراج کو دوبارہ زندہ کرنے کی فکر میں تھے۔ اس سامراج کو تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دم توڑتے دیکھا تھا۔ محمد شاہ کا دور، نادر شاہ کا حملہ، مرہٹوں کی شورشیں، جاٹوں کی بغاوتیں، دہلی کی تباہی و بربادی، یہ سب ان کے سامنے کے واقعات تھے۔ شاہ صاحب نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا۔ اب اگر کوئی حکومت بنے گی تو اس کی اساس کوئی اور ہو گی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی وہ ہمہ گیر تحریک تھی۔ اُن کے نزدیک پورا ہندوستان تھا۔ چونکہ مرکزی حکومت کی قیادت اس وقت تک مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے لامحالہ شاہ صاحب نے عام مسلمانوں سے خطاب کیا۔ لیکن شاہ صاحب کی دعوت کے اُصول عام انسانیت کے اُصول تھے۔ ان کا زور مذہب کی رسوم پر نہیں بلکہ مذہب کی روح پر تھا۔ قانون کی ظاہری شکل پر نہیں بلکہ قانون کی جان یعنی عدل و انصاف پر تھا۔ وہ تمام مذاہب کی اصل یہ چار اصول بتاتے ہیں:۔۔۔ اوّل

خدا پرستی، دوسرے عدل و انصاف، تیسرے صحت و صفائی اور چوتھے تربیت نفس۔ ان کے نزدیک مذہب کا فرض یہ ہے کہ ان چار مقاصد تک انسانوں کی رہنمائی کرے۔ گو مذاہب کے طریقے الگ الگ ہیں، لیکن ہر مذہب کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ خدا تک پہنچنے کی راہ لوگوں کو دکھائے۔ اور نیکو کاروں کی پہچان ان کی خدا پرستی ہے نہ کہ رسوم پرستی۔"

شاہ صاحب نے معاشی عدم مساوات کی بھی بڑی خرابیاں گنائی ہیں۔ اور شہنشاہیت اور اُس سے پیدا ہونے والے مفاسد کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو۔ اس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ وہاں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔ شاہ صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قیصر و کسریٰ نے متمدن دُنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور قدرت الٰہی مجبور ہوئی تھی کہ اسلام کے ذریعہ اس روگی نظام کو ختم کر دے۔ اسی طرح آج کی حکمران سوسائٹی بھی ان اجتماعی بیماریوں سے کھوکھلی ہو چکی ہے۔ اور ظاہر ہے اس کا مٹنا بھی یقینی نظر آتا ہے۔ اب مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور اس عہد کی دوسری چھوٹی چھوٹی تحریکیں اپنی اپنی جگہ پہ ٹھیک ہوں گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی تحریک میں بھی اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت اور وحدت کو بحال رکھ سکنے کی تدبیر سوچتی۔ شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو۔ اور یہ انصاف کرنے والا خواہ ایک امیر ہو یا کئی ایک یا پوری قوم۔ یعنی آجکل کی اصطلاح میں جمہوری حکومت۔ یہ خلاصہ ہے شاہ صاحب کے سیاسی فکر کا۔ اور ہماری رائے میں یہ فکر آج بھی متحدہ ہندوستان کی اساس بن سکتا ہے۔

اب اگر کہا جائے کہ اگر شاہ ولی اللہ کے فکر کا دامن اتنا وسیع تھا اور ان کے اجتماعی اور سیاسی نظام میں سارے انسانوں کو بلا تفریق مذہب و ملت ایک سے سلوک کا مستحق سمجھا جا سکتا

تھا تو پھر شاہ ولی اللہ کی تحریک نے فرقہ وارانہ حیثیت کیوں اختیار کی۔ بات یہ ہے کہ پنجاب میں سکھوں نے صرف مغلیہ حکومت سے جنگ شروع نہیں کی تھی، بلکہ وُہ کل مسلمانوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ اس طرح مرہٹوں نے بادشاہی نظام کے اہل کاروں کو قتل نہ کیا بلکہ عام مسلمان ان کے مظالم کا نشانہ بنے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وُہ خود اپنی حفاظت کرتے۔ قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں یہ منزل ایسی نازک ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ایسے صلح کل اور سراپا مہر و محبت پیغمبر بھی اپنے حواریوں کو تلوار سنبھالنے کا مشورہ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی جماعت کا مرہٹوں اور سکھوں کے خلاف معرکہ آرا ہونا نتیجہ تھا ان خاص حالات کا جن سے اُس وقت مسلمانوں کو پالا پڑا۔ جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے، شاہ ولی اللہ کی جماعت مغلوں کے تخت و تاج کے لئے نہیں لڑی تھی۔ وُہ تو ان عام انسانی اصولوں کو جن پہ ان کے نظام کی بنیاد تھی، زندہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی وُہ اُصول تھے جن کے ذریعے ہمارے خیال میں ہندوستان نیا جنم لے سکتا تھا۔ بہرحال اب تو انگریزی تسلط نے نہ سکھوں کو چھوڑا۔ اور نہ مرہٹوں کا راج رہا۔ زمانہ بدل گیا اور زمانے کے ساتھ ہندوستان کے حالات بھی بدل گئے۔ جب دشمنیوں کے اسباب نہ رہے تو اب پُرانی دشمنیاں بھی بے معنی ہیں۔ ضرورت ہے کہ دہلی کے اس خدا پرست فلسفی صُوفی کے افکار کو از سرِ نو پڑھا جائے اور ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر میں اس سے ہدایت حاصل کی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان کے جھگڑوں کا حل شاہ صاحب کے مجوزہ نظامِ فکر سے ہو سکتا ہے۔

حزب ولی اللہ کا پہلا دور

حکیم الہند امام ولی اللہ

۱۱۳۱ھ تا ۱۱۷۶ھ

جس سال اورنگ زیب عالمگیر کے تخت پر سلطان[1] محمد شاہ متمکن ہوا، اُسی سال دہلی کے مرتاض صُوفی اور عالم مولانا عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری (متوفی ۱۱۳۱ھ) کے مدرسہ میں حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی باپ کی مسندِ تدریس پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ ۱۷۱۹ء (۱۱۳۱ھ) کا واقعہ ہے۔

امام ولی اللہ کی ولادت بروز چہار شنبہ ۱۱۱۴ھ اور وفات ۱۱۷۶ھ میں ہوئی۔ سلطان مجدّد عالمگیر کی وفات بروز جمعہ ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ میں ہوئی۔ اس حساب سے شاہ صاحب کی ولادت سلطان مجدد کی وفات سے چار سال پہلے ہوئی اور شاہ عالم ثانی نابینا مکحول بادشاہ کے عہد میں آپ کا انتقال ہوا۔ شاہ صاحب کو دس سلاطین دہلی کی حکومت دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ عالمگیر اعظم، بہادر شاہ اوّل، معز الدین جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہِ عالم ثانی۔ آخر الذکر نابینا سلطان کے عہد میں شاہ صاحب کی وفات سے تقریباً دو سال بعد کلائیو نے الہ آباد کے مقام پہ بنگالہ اور بہار و اڑیسہ کی دیوانی بادشاہ سے لے کر کمپنی بہادر کے حوالے کی۔

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مذکورہ بالا سلاطین کے عہد میں ہندوستان کو کن کن لرزہ خیز واقعات و حوادث سے گزرنا پڑا۔ سادات بارہ کا تسلط، فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں بصد بیکسی قید میں مرنا، پھر تورانی اُمراء کے ہاتھوں سادات بارہ کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج، سکھوں کی بغاوت،

---

[1] امام ولی اللہ اور محمد شاہ کی ولادت کا ایک ہی سال ہے صرف مہینے کا فرق ہے۔ شاہ صاحب کی ولادت ماہ شوال میں ہے اور سلطان غالباً ماہ ذیقعدہ میں پیدا ہوئے (تاریخ ہند از ذکاء اللہ)

نادر شاہ کی یلغار اور دہلی میں قتلِ عام، احمد شاہ ابدالی اور معرکۂ پانی پت میں حق کا باطل پر غلبہ، سیاست ہند میں روہیلوں کی شرکت و ساہمت، ایرانی و تورانی اُمراء کی رقیبانہ چپقلش، ہندوستان میں یورپین اقوام کی للچائی ہوئی نگاہیں، پھر انگریزوں کا بنگال و بہار وغیرہ میں عمل دخل اور اس قسم کے دوسرے انقلابات شاہ صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

دہلی کی سلطنت جس اضطراب سے گزر رہی تھی، شاہ صاحب اس کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بعد میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے تو سلطنت عثمانیہ اور دوسری اسلامی حکومتوں کا بھی مطالعہ کرتے رہے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں "احوال ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشاء فقیر است۔ بلادِ عرب نیز دیدیم۔ و احوال مردم ولایت از ثقاتِ آنجا شنیدم۔" "ہند کے حالات ہم سے مخفی نہیں کہ وہ فقیر کا مولد اور وطن ہے۔ نیز بلاد عرب کو میں نے دیکھا ہے اور ولایت کے لوگوں کے احوال قابل اعتماد افراد سے سُنے ہیں"۔ ظاہر ہے ان واقعات و حوادث سے ان کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔

شاہ صاحب اپنے زمانۂ طالب علمی کا ذکر فرماتے ہوئے اپنی کتاب "جزو لطیف" میں لکھتے ہیں۔

> "جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو فقیر مکتب میں داخل ہوا۔ ساتویں برس والدِ بزرگوار نے نماز پڑھوائی اور روزہ رکھنے کی تلقین فرمائی۔ اس سال ختنہ کی رسم بھی ادا ہوئی مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں میں نے قرآن عظیم ختم کیا۔ دس سال کی عمر میں شرح ملّا جامی پڑھی اور عام مطالعہ کی راہ میرے لئے کھل گئی۔ چودھویں برس میری شادی کر دی گئی اور اس معاملے میں والد بزرگوار نے بڑی عجلت سے کام لیا۔ پندرہ سال کا تھا کہ میں نے اپنے والد کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور تصوّف کے اشغال میں لگ گیا، اور اس میں خاص طور پر نقشبندی مشائخ کے طریق کو اپنا مقصود بنایا۔ اسی سال تفسیر بیضاوی کا ایک حصّہ پڑھا۔ اس سال والدِ بزرگوار نے وسیع پیمانے پر کھانے کا انتظام کیا اور خواص و عوام کو دعوت دی اور اس موقع پر مجھے درس دینے کی اجازت دی گئی۔ الغرض اپنی عمر کے پندرھویں سال اپنے ملک کے دستور کے مطابق

> جو ضروری علوم و فنون تھے، میں ان سے فارغ ہو گیا۔ سترہ سال کا تھا کہ حضرت والد رحمتِ حق سے جا ملاقی ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد فقیر بارہ سال تک دینی اور علوم عقلیہ کی کتابیں پڑھاتا رہا اور ہر علم میں فکر و غور جاری رکھا۔“

حکیم الہند نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس طرح بارہ برس پڑھانے میں صرف کیے۔ آپ نے جو علوم و معارف اپنے والد اور اُن کے رفقاء سے سیکھے تھے، ان میں سے قرآن عظیم کا ترجمہ، حکمت عملی اور اشراق قلبی کے ذریعے علمی حقائق کا انکشاف اُن کی توجہ کا خاص مرکز بنے رہے۔

شاہ صاحب ”تفہیمات الہیہ“ میں اپنے زمانے کی تین چیزوں کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہیں۔ ایک برہان یعنی عقل، حکمتِ عملی اسی کا ایک شعبہ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مسلمانوں میں یونانی علوم فلسفہ و منطق کا رواج ہو چکا ہے۔ اور وُہ علم کلام سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ دوسرا وجدان، اشراق یا کشف۔ اس زمانے میں لوگ شرقاً غرباً صوفیہ کے علوم قبول کرنے پر متفق ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے اقوال اور حالات لوگوں کے لیے کتاب اور سنّت سے بھی زیادہ مرغوب خاطر ہیں۔ بلکہ عامۃ الناس تو صوفیہ کے رموز و ارشادات کے بغیر کوئی چیز قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی ان کے رموز و ارشادات ماننے سے انکار کر دے۔ یا ان سے بے توجہی برتے تو لوگ اس کی بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اور نہ اسے نیکوکاروں میں سمجھا جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اسی بناء پر وجدان، اشراق قلبی یا کشف اس زمانے میں ایک ضروری موضوعِ علم بن گیا ہے۔

تیسری چیز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول علوم۔ اور ان میں قرآنِ عظیم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ ان تین امور کے ماسواء اس زمانے میں ہر شخص صرف اپنی رائے کو قابل اتباع سمجھنے کے روگ میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ کوئی شخص مشکلات کو حل کرنے کے لئے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ہر کہ و مہ اپنی سمجھ کے مطابق احکام شرعیہ کے معانی اور اسرار پر بحث کر لیتا ہے اور اپنی عقل کو اس تمام معاملے میں اصل

قرار دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہلِ عصر فقہ کے مختلف اصناف میں بھی اختلاف کر رہے ہیں خصوصاً حنفی اور شافعی۔ اور ہر فرقہ اپنے اساتذہ کو ترجیح کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر فقہی مذہب میں استخراجی مسائل کی کثرت ہوگئی ہے اور حق کا پتہ لگانا مشکل ہوگیا ہے۔ ان حالات میں طبعی طور پر حکیم الہند کو اپنی دعوتِ تجدید کے ضمن میں ان تین امور کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی۔

قرآنِ عظیم کے ترجمہ کے سلسلے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

”اس فقیر پر بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ مجھے متعدد بار اپنے والد بزرگوار کے درسِ قرآن میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ قرآن کے معانی بڑے غور و تدبر کے ساتھ بیان فرماتے۔ آیات کی شانِ نزول کی وضاحت کرتے اور حل طلب امور کے لیے تفسیروں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ اس کی وجہ سے میرے سامنے فتح و کامیابی کا ایک میدان کھل گیا۔ والد بزرگوار کا دستور یہ تھا کہ اپنے رفقاء کے حلقہ میں ہر روز تین رکوع سے کم مقدار میں قرآن کی تلاوت کرتے اور اس کے معانی پر غور و خوض فرماتے۔“ خود شاہ صاحب نے حج سے واپس آکر پانچ سال کے بعد قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ[1] کیا اور اس کے گیارہ سال بعد پہلی بار اس کی تعلیم شروع کی۔

حکمتِ عملی سے مُراد یہاں مطلق حکمتِ عملی ہے۔ قرآنِ عظیم کی حکمتِ عملی، یہ شاہ صاحب کا اپنا استخراج ہے۔ شاہ صاحب سے بہت پہلے اکبر اعظم کے دَور سے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں حکمتِ عملی کی طرف خاص توجہ کی جانے لگی تھی۔ ابوالفضل نے اسی حکمتِ عملی کی اساس پر اکبری نظام کی بنا رکھی تھی اور محمد شاہ کے عہد تک سلطنت کے کاروبار کا مرکزی فکر یہی رہا۔ شاہ صاحب اس حکمتِ عملی کو قرآن کے تعارف کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ بلاغت کے ذریعہ قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا اس سوسائٹی کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ ہوتا یہ کہ بلاغت کے علوم پڑھتے پڑھتے

---

[1] مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ نے قرآن کا ترجمہ کیا۔ اس سے دہلی میں اس قدر شورش برپا ہوئی کہ وہ حج پر جانے کے لیے مجبور ہو گئے۔ موصوف کا یہ بیان ٹھیک نہیں۔

لوگوں کی عمریں ختم ہو جاتیں۔ اور انہیں قرآن کو ہاتھ لگانا نصیب نہ ہوتا۔ شاہ صاحب نے دیکھا کہ ان کے زمانے کی اعلیٰ سوسائٹی حکمتِ عملی کو سمجھتی اور پہچانتی ہے اور اسی کو اپنی اساسِ زندگی مانتی ہے۔ چنانچہ آپ نے اسی حکمتِ عملی کو قرآن کے تعارف کا ذریعہ بنایا اور اس عہد میں جو مروجہ اور متداول حکمتِ عملی تھی، اسے قرآن کے عملی تصورات کے تابع کیا۔ اس طرح قرآن کی حکمتِ عملی کا اساسی فکر مسلمانوں کے سامنے پیش فرمایا۔

شاہ صاحب بارہ برس تک اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس زمانے کی دہلی میں اگر ایک طرف خرابی پیدا ہو گئی تھی تو اس کے ساتھ ہی گزشتہ عظمت کے بچے کھچے آثار بھی یقیناً ابھی اس میں موجود تھے۔ طبقۂ امراء میں آصفؒ جاہ جیسا فرزانہ مدبر اور سیاست داں تھا جس نے آگے چل کر دکن میں اپنی مستقل حکومت کی بنیاد رکھی۔ طبقۂ صوفیہ میں مرزا محمد مظہر جانؒ جاناں رح اس زمانے کی یادگار ہیں۔ شہر میں مختلف کتب خانے اور باکمال اساتذہ تھے۔ الغرض اس عہد کی دہلی میں ایک صاحبِ فکر کے لیے مطالعہ، تدبر اور سوچ بچار کے لئے ایک وسیع میدان موجود تھا۔

امام ولی اللہ نے اپنے اس بارہ برس کے مطالعہ میں اصلاحی پروگرام کے دو اصول معین کیے۔

(۱) قرآن عظیم کی حکمتِ عملی، یعنی انسانوں کی عملی زندگی کے متعلق قرآنی تصورات ہی حقیقت میں ایک معجزہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اساس علمی اصلاح کے لئے تجویز ہوا۔

(۲) معاشرت، اجتماع، حکومت اور ملت میں تمام اخلاقی اور عملی خرابیوں کا باعث دراصل معاشی اور اقتصادی عدم توازن ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن عظیم کا معجزہ ہونا تو سب مسلمانوں کے لیے مسلم ہے لیکن ہر گروہ کا اعجاز قرآن کے متعلق اپنا اپنا نظریہ ہے۔ فلسفی مزاج علمائے اسلام نے بہت پہلے اس اعجاز قرآن کو جو عربی بلاغت سے وابستہ ہے چنداں اہمیت نہیں دی۔ اس پر ان کے مخالفین کی طرف سے بہت کچھ لے دے بھی ہوئی، لیکن اگر ان فلسفی مزاج لوگوں کے اقوال کی یہ توجیہ کی جائے کہ عجمی اقوام چونکہ عربی بلاغت کے اعجاز کو کما حقہٗ سمجھنے سے قاصر تھیں۔ اس لیے ان کے لیے قرآن کے اعجاز کا معیار عربی بلاغت نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ

مجبور تھے کہ اعجاز کا معیار کسی دوسری چیز میں ڈھونڈیں۔ اس سے سارا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

عبدالرحیم خیاط معتزلی عالم اپنی کتاب "الانتصار" میں لکھتا ہے کہ نظام یعنی ابراہیم بن سیار کی رائے تھی کہ قرآن اپنے اسلوب بیان کی بنا پر اعجاز کی حیثیت نہیں رکھتا۔ لوگ اگر چاہیں تو اس جیسا اسلوب بیان پیش کر سکتے ہیں۔ ابوالعلاء معری نے تو اس باب میں ایک نظریہ "الصرفۃ" کے نام سے پیش کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے خود ہی قوائے بشریہ کو معارضۂ قرآن سے روکا ہوا ہے ورنہ انسان ایسا قرآن لا سکتے تھے۔ معجم الادباء میں یاقوت حموی نے اس سلسلے میں نقل کیا ہے کہ ابوالعلاءؒ معری کے نزدیک قرآن اپنی فصاحت میں اعجاز کا حکم نہ رکھتا تھا اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن اس شکل میں معجزہ تھا۔ کیونکہ یہ تو ہر فصیح و بلیغ کی قدرت میں ہے کہ وہ اس جیسا قرآن لا سکے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے روک دیا ہے۔ اس طرح قرآن اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ بن گیا ہے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ اہل کلام اور شیعیوں کی ایک جماعت بھی اس طرح کا عقیدہ رکھتی ہے، جن میں بشر المریسی اور مرتضیٰ ابوالقاسم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

الغرض شاہ صاحب نے قرآن کے اعجاز کو اس کے بتائے ہوئے نظام حیات میں متعین فرمایا۔ اس طرح قرآن کی عملی افادیت ان کے نزدیک اس کا معجزہ ہونا ثابت ہوگیا۔ اب قرآن کے اس نظام حیات سے ہر شخص خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، عامی ہو یا عالم، فلسفی ہو یا سادہ مزاج، مستفید ہو سکتا ہے اور اس کے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا تو اس صورت میں معدودے چند افراد کے سوا دوسرے لوگ اس کی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔

قرآن کی حکمت عملی کے علاوہ شاہ صاحب کے اصلاحی پروگرام کا دوسرا اصول اقتصادیات میں توازن اور مساوات کی اہمیت واضح کرنا تھا۔ عام طور پر تصوف فلسفۂ اخلاق سے شروع ہوتا ہے گو حیوانی زندگی کے لیے اقتصادی ضروریات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ لیکن انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے، اس پر کسی نے توجہ نہ کی۔ اس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہو گئی۔ ہمارے بڑے بڑے عقلمند اور زیادہ با اخلاق صوفیہ سب کے سب اجتماعی سیاست سے دور رہنا اپنا کمال سمجھتے رہے تصوف کی کتابوں کی سب سے بڑی کوتاہی یہی تھی کہ ان کے مدون کرنے والوں نے انسانی اخلاق اور

اقتصادیات کے باہمی رشتے اور اُن کے ایک دوسرے سے متاثر ہونے کی اہمیت کو نہ سمجھا۔ اس کے برعکس شاہ صاحب نے زندگی کی اس حقیقت کو اس کی صحیح شکل میں پہچانا اور بار بار اپنی کتابوں میں اس کی طرف توجہ دلائی۔ حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

,, اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری ہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمران جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنالے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اُس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لئے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالےٰ انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لئے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ قدرتِ الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اتار دے۔ چنانچہ کسریٰ و قیصر کی حکومت نے یہی وتیرہ (آرام و آرائش۔ رفاہیت بالغہ) اختیار کر رکھا تھا۔ اس مرض کے ازالے کے لئے امیین (عربوں) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا گیا۔ فرعون کی ہلاکت اور قیصر و کسریٰ کی تباہی اس اصول پر لوازم نبوت میں سے شمار ہوتی ہے ''

ضمنی طور پر شالوں کے ذیل میں کہ دہلی کے بادشاہوں اور امیروں کی حالت بھی کسریٰ و قیصر کے لگ بھگ جا پہنچی ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ **وما تراہ من ملوک بلادک یغنیک عن حکایتھم**۔ تم جو اپنے ملک کے بادشاہوں کی حالت دیکھ رہے ہو، وہ تمہیں اُن (قیصر و کسریٰ) کی حکایتوں سے بے نیاز کر دے گی، دوسرے موقع پر جہاں انہوں نے ربوٰا (سُود) سے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ اسلام نے ربوٰا کو قطعی طور پر بند کر دیا ہے، وہاں تفصیل سے بتایا ہے کہ ,, رفاہیت بالغہ'' کے مرض سے سوسائٹی کو محفوظ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے۔ اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی اقتصادی ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے، تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ رہتا ہے، زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں۔ لیکن اگر لوگوں کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں اور ان کی وجہ سے اُن کی زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا ان[1] میں سے کسے ہوش رہے گا۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اخلاق تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔

جب انسان کے اخلاق اس دنیا میں سدھر گئے اور تہذیبِ نفس کے ذریعے اس نے اپنے اخلاق کی تکمیل کر لی تو لازمی طور پر موت کے بعد دوسری زندگی میں اس کے لیے قبر اور حشر کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔ اخلاق کی یہ تکمیل ہی اسے جنّت کا حق دار بنائے گی۔ اس کی آخری ارتقائی منزل یہ ہے کہ انسان اپنے ربّ کی رُؤیت سے بہرہ ور ہو۔ اگر انسانی اجتماع کو ترقی کی اس راہ پر چلانا نبوت کا اصل مقصد سمجھ لیا جائے تو نبوت انسانی زندگی کے لیے ایک فطری[2] چیز بن جاتی ہے۔ نیز جہاں نبوت نہ ہو، وہاں انبیاء کے اتباع یعنی صدّیق اور حکیم یہ کام کریں تو اس طرح انسانیت کا مجموعی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک اقتصادی توازن کے یہ معنی ہیں۔

قرآنی حکمتِ عملی اور اقتصادی توازن — یہ دو اصول تھے شاہ صاحب کے مجوزہ اصلاحی پروگرام کے۔ مختصر الفاظ میں اوپر جو لکھا گیا، یہ مراد تھی ان دو اصولوں سے۔ شاہ صاحب اپنے والد بزرگوار کی وفات کے پورے بارہ برس تک ان امور پر برابر غور و خوض کرتے رہے۔ اور دہلی میں رہتے ہوئے ان مسائل کے متعلق بحث و نظر کے وہاں جو مواقع تھے، ان سے وہ مستفید ہوئے۔ حکیم الہند اپنے اس لائحہ عمل کو ایک مدلّل شکل میں اپنی قوم کے اربابِ فکر کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ اور

انسان کی پوری زندگی کی تہذیب اور اصلاح نبوت کا اولین مقصد ہے باقی حاشیہ صفحہ ۳۵ پر

اس کے لئے جس قدر علم حدیث کی ضرورت تھی، اس کی تحصیل دہلی میں ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اس غرض کے لیے آپ حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں کامل اساتذہ کی صحبت اور اعلیٰ علمی کتابوں کے مطالعہ سے دو سال کے عرصہ میں آپ نے حدیث و فقہ میں مجتہدانہ کمال[۳] پیدا کر لیا جو دعوتِ تجدید کے لئے ایک ضروری امر تھا۔

اپنے اس سفرِ حجاز کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ اس طرح بارہ سال گزرنے پر میرے دل میں حرمینِ پاک کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ ۱۱۴۳ھ میں فقیر حج سے مشرف ہوا۔ اور ۱۱۴۴ھ کا سال مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں گزرا۔ یہاں شیخ ابو طاہر قدس سرہ، اور حرمین پاک میں دوسرے مشائخ سے حدیث پڑھی۔ اسی زمانے میں فقیر نے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ سے بے شمار فیوض پائے ـــ دورانِ قیامِ حجاز میں حرمین پاک کے باشندوں اور وہاں کے علماء وغیرہ سے بڑی دلچسپ صحبتیں رہیں۔ شیخ ابو طاہر نے اپنے طریقت کے خرقہ سے، جو تصوف کے سب طریقوں پر جامع اور مشتمل تھا، مجھے نوازا۔ اس سال کے آخر میں دوبارہ حج کیا۔ ۱۱۴۵ھ میں” وطن کی طرف لوٹا اور رجب کی چودھویں تاریخ جمعہ کے دن خیر و عافیت کے ساتھ گھر پہنچا۔ (جزو لطیف)

منصب تجدید کے لئے ضروری تھا کہ علوم حدیث و فقہ میں اجتہاد پیدا کیا جاتا۔ چنانچہ حرمین پاک کے دورانِ قیام میں شاہ صاحب نے اجتہاد میں کمال حاصل کر لیا۔ اسی کے ساتھ اُن کی قوتِ اشراق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے بھی استفادہ کیا۔ اپنی کتاب ”فیوض الحرمین“ میں انہوں نے ان تمام فلسفی، سیاسی، اجتماعی فوائد کا ذکر کیا ہے، جو انہیں اس طرح حاصل ہوئے۔

برسوں کے مطالعہ، مشاہدہ، غور و فکر اور پھر خاص طور پر ان فیوضِ حرمین کے بعد شاہ صاحب کی ذات انقلابی قوتِ عمل کو اپنے اندر پورے کمال پہ بیدار اور متحرک پاتی ہے۔ اور جو کچھ انہیں مستقبل میں پیش آنے والا ہے، وہ اسے خواب میں دیکھتے ہیں۔ شاہ صاحب نے جمعہ کی رات ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ

(بقیہ حاشیہ) ابن خلدون کا یہ نظریہ کہ انسان کو صرف امورِ آخرت معلوم کرنے کے لئے نبوت کی ضرورت پڑتی ہے اور دنیاوی معیشت کا نظام محتاجِ نبوت نہیں“ نادرست ہے۔

(۱۷۳۰ء) کو مکہ معظمہ میں ایک الہامی خواب دیکھا، اس کا حاصل ہم اپنی زبان میں تحریر کرتے ہیں۔

(۱) انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کے ذریعہ موجودہ مفاسد کا تدارک ہوگا۔ یعنی وُہ ان خرابیوں کو دُور کرنے میں ایک مستقل ذمہ دار حیثیت کے مالک ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی انقلابی تعلیمات ایک مستقل حکومت[الف] کا باعث اور موجب بنیں گی۔

(۲) انہیں بتایا گیا کہ پہلا نظام توڑ کر اس کی جگہ وُہ نیا نظام قائم کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔ یعنی وُہ ہندوستانی مسلمانوں کے تمام دینی علوم اور سیاسی اور اجتماعی تحریکات میں مستقل امام ہوں گے۔

(۳) انہیں سمجھایا گیا کہ ان کی اصلاحات نافذ کرنے کے لیے باہمی لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ پیش آنے والا ہے۔

مختصراً اس سارے خواب کا حاصل یہ نکلا کہ حکیم الہند اسلامی ہندوستان میں ایک مکمل اجتماعی انقلاب کے شروع کرنے والے ہوں گے۔

اس عزم کے ساتھ شاہ صاحب دہلی واپس آئے۔ سب سے پہلے آپ نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ[ب] فتح الرحمان مکمل کیا، جس میں اجمالی طور پر اپنے پروگرام کو درج کر دیا۔ اور ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں اس کی تدریس بھی شروع کر دی۔ شاہ صاحب کے اجمالی پروگرام کو سمجھنے کے لیے ان کے ترجمۂ قرآن کے حواشی سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ شاہ صاحب نے فتح الرحمان کے حواشی میں وُہ تمام چیزیں درج کر

[الف] جس طرح فقہ میں بعض مجتہد منتسب کا درجہ رکھتے ہیں۔ یعنی وہ مستقل مجتہد کے تابع ہوتے ہیں۔ اس طرح بعض حکومتیں بھی پہلے خاندان شاہی کی تابع ہو کر منتسب کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ اس کے بالمقابل مجتہد مستقل کی طرح اصل انسانیت پر غور کر کے نئے اصول و ضوابط پر حکومت بنتی ہے، اس کو حقیقی مستقل حکومت کہنا چاہیے۔ شاہ صاحب کی علمی تحریک دراصل اس امر کی مقتضی تھی کہ ایسی حکومت پیدا کی جائے جس کو خلافت راشدہ کے سوا کسی اور سے انتساب نہ ہو۔ [ب] قرآن کریم کا فارسی ترجمہ ہندوستان میں سب سے پہلے ملک العلماء شہاب الدین ہندی دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ نے اپنی تفسیر بحر مواج

باقی حاشیہ صفحہ ۳۷ پر

دی ہیں، جو اُن کی دعوتِ تجدید میں اساس کا حکم رکھتی تھیں۔ سب سے پہلی بات جن کی طرف شاہ صاحب نے توجہ دلائی وہ یہ ہے کہ اسلام کی حکومت مکہ ہی میں وجود میں آگئی تھی۔ اور یہ اپنی جگہ مستقل حکومت تھی۔ گو اس زمانہ میں ابھی تشدد اور لڑائی کی اجازت نہ ملی تھی۔ سورۃ "رعد" کے آخری فائدے میں

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔ "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں۔ اور (جیسا چاہتا ہے) حکم کرتا ہے۔ کوئی اُس کے حکم کا رد کرنے والا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔" کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اسلام کی شوکت روز بروز عرب کی سرزمین میں ترقی کر رہی تھی اور دار الحرب کا دائرۂ اثر بتدریج کم ہو رہا تھا۔ گو عام مفسرین نے اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے۔ لیکن مترجم کے نزدیک اس کا مدنی ہونا ضروری نہیں۔ دار الحرب کے دائرۂ اثر کے کم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عرب کے مختلف قبائل مثلاً اسلم، غفار، جہینہ، مزینہ اور بعض یمنی قبائل مسلمان ہو رہے تھے۔ یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔" الغرض شاہ صاحب کے نزدیک مکہ میں اسلام کی حکومت بن چکی تھی گو اصولاً یہ عدم تشدد پر عامل تھی۔

(البلاغة) میں کیا ہے (آپ کے حالات ابجد العلوم صفحہ ۸۹۳ میں ملیں گے) بحر مواج میں وہ ہر ایک فن کے متعلق قرآنی تحقیق علیحدہ علیحدہ عنوانوں سے لکھتے ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے ایک آیت نقل کرتے ہیں اور اس کے نیچے "الترجمہ" لکھ کر اس کا فارسی ترجمہ کر دیتے ہیں پھر لکھتے ہیں "الاعراب" پھر "البلاغت"۔ پھر شان نزول وغیرہ، ساری کتاب اسی طرح مرتب کی ہے۔ چنانچہ اس میں ترجمۂ قرآن کی ایک مستقل اور مکمل حیثیت ہے۔ اس کتاب کی پہلی بار طباعت ہو چکی ہے۔ ملک العلماء کے حاشیۂ کافیہ اور میر سید شریف کے ترجمۂ فارسی کو دیکھ کر مولانا جامی نے ایک جدت پیدا کی اور شرح ملا جامی لکھی۔ ملک العلماء کی شرح کافیہ کا نہایت خوشخط نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ الغرض قرآنِ عظیم کا پہلا فارسی ترجمہ شیر شاہ سوری کے استاد نے کیا۔ ان کا مطمحِ نظر قرآنی بلاغت کا اعجاز تھا۔ دوسرا ترجمہ امام ولی اللہ دہلوی کا ہے جن کا نصب العین قرآنی حکمت کا اعجاز تیار کرنا تھا۔

شاہ صاحب نے اِسی نظامِ مکی کی تقلید میں اپنی انقلابی تحریک کو چلایا۔ انہوں نے تصوّف کے خاص طریقہ کی بعیت کو اپنے سیاسی نظام کا اساس بنایا۔ دوسرے لفظوں میں طریقت کی بیعت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ بیعت کرنے والے نے جماعت کا سیاسی نظام تسلیم کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاست میں تصوف کو اتنا بلند دینی درجہ دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب تک حکومت کو چلانے کی استعداد پیدا نہ ہو، کوئی شخص لڑ کر نیا نظامِ حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ بے شک وُہ لڑائی کے ذریعہ پچھلی حکومت کو تباہ تو کر سکتا ہے، لیکن جب تک تربیت یافتہ آدمی اسے میسّر نہ آئیں، وُہ نئی حکومت چلا نہیں سکتا۔ اور اس قسم کی تربیت اور استعداد صرف عدم تشدّد کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر نئی تحریک کو شروع میں اپنا پیغام دوسروں کو سنانے اور ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے عدم تشدد پر لامحالہ عمل کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب نے اسی اصول پر اپنی جماعت تیار کرنا شروع کی۔ وُہ اس میں کامیاب ہوئے۔ ان کے بعد اُن کے جانشین شاہ عبدالعزیز نے نظامِ حکومت چلانے کے لئے آدمی بھی تیار کر دیئے۔

بے شک اس زمانے میں ایسے باخبر لوگ موجود تھے، جنہیں اس انقلابی تحریک کا احساس ہوا۔ انہوں نے عوام میں شورش پھیلا کر مسجد فتح پوری سے نکلتے وقت حکیم الہند پر حملہ کرا دیا۔

امام ولی اللہ نے اپنے اس فکر کی اشاعت اور تعلیم کی غرض سے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ وُہ سب دہلی کی علمی زبان عربی اور عام پڑھے لکھوں کی زبان یعنی فارسی میں تھیں۔ ان کتابوں میں حکیم الہند نے اپنی دعوت کے اصول اور مسائل ضبط کر دیئے۔ لیکن اس معاملہ میں اتنا التزام فرمایا کہ ان امور کو ایک جگہ قلمبند نہ کیا بلکہ ان کو اپنی تصانیف میں اِدھر اُدھر پھیلا کر بیان کر دیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وُہ نا اہل لوگوں کی دست بُرد سے محفوظ رہیں۔

شاہ صاحب کے پروگرام کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ امام ولی اللہ کی حیثیت اُمّتِ محمدیہ میں ایک عظیم الشان صدیق اور حکیم کی ہے۔ اس طرزِ فکر کے اربابِ کمال انبیاء کی طرح تمام انسانیت کو اپنا مخاطب بناتے ہیں، گو بظاہر ان کی دعوت اپنی قوم کے لئے ہوتی ہے۔ امام ولی اللہ کی کتابیں غور سے پڑھی جائیں تو صاف نظر آئے گا کہ ان کی زبان اگرچہ دہلی کی

زبان ہے۔ لیکن ان کے مخاطب دہلی کے اعلیٰ طبقہ کی توسط سے ایک طرف یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کی عربی و عجمی قومیں ہیں تو دوسری طرف یونان، ایران اور ہند کی صابی (آرین) قومیں بھی مساوی درجہ پر خطاب میں شریک ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حکیم الہند کا روئے سخن دراصل تمام انسانیت[الف] کی طرف تھا۔ وہ اپنی کتاب "بدور بازغہ" میں ارتفاقات کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

> "ہم نے یہاں ان ارتفاقات (اجتماعی اداروں) کے احکام اور ان سے متعلقہ علوم کے بیان میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔ لیکن اس معاملے میں دو باتیں ضرور پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ارتفاقات کی وضاحت کے سلسلے میں عموماً ایک معین مثال کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس سے ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا بلکہ یہ یا اس جیسی کوئی اور یا اس کے لگ بھگ کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارا اصل مقصود تو یہ ہے کہ وہ عمومی قواعد، جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ان پر اجتماعی ادارے پورے اتریں۔ ظاہر ہے یہ ادارے ہر قوم اور ہر ملک میں ایک سے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہر قوم کی اپنی خاص عادتیں اور اپنے مخصوص علوم ہوتے ہیں۔ البتہ ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ یہ ادارے عمومی قواعد کے مطابق ہوں۔ خواہ ظاہری شکل و صورت میں یہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہی ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان خود اپنی جبلت اور طبیعت کے تقاضے

[الف] شاہ ولی اللہ جب قرآن شریف کی تشریح کرتے ہیں تو اس میں یونان اور ہند کو بھی سامنے رکھتے ہیں ہمارے اہل علم کو یہ چیز گراں گزرتی ہے۔ وہ شاہ صاحب کو ایک مدرسہ اور ایک مسجد کا مجدد یا امام وغیرہ وغیرہ سب کچھ مانتے ہیں۔ لیکن یہ کہ وہ تمام انسانیت کی اصلاح کے داعی تھے، ان پر شاق گزرتا ہے۔ ہم صلاحیت پسند بزرگوں کے ذہنی بُعد کو تو دور کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ضدی طبیعتوں کو خطاب کرنا نہیں چاہتے۔ قرآن شریف نے مَنْ تَوَلّٰی وَاَدْبَرَ "جو پھر گیا اور پیٹھ موڑی" کو اپنے مخاطبین کی صف سے نکال دیا ہے۔ ہم بھی قرآن مجید کے اس اصول پر عمل کرتے ہوئے امت محمدیہ کے اس حکیم کی دعوت کا مخاطب ضدی طبیعتوں کو نہیں بناتے۔

سے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے ارتفاق (اجتماعی ادارے) کی تشکیل کرے۔ یہ پہلا درجہ ہے۔

دوسرے درجہ میں تجربی علوم اور صحیح اخلاق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔"

اس سے زیادہ تفصیل "بدور بازغہ" کے تیسرے مقالہ کے شروع میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"تمہیں جاننا چاہیے کہ وہ تمام ارتفاقات (اجتماعی ادارے) جن پر انسانی نظامِ تمدن کی عمارت کھڑی ہے۔ اور کل کے کل اقترابات (خدا تک پہنچنے کے وسائل) جو انسانوں کی فطرت میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ مثلاً "احسان" "عبادت"، برائیوں سے اجتناب وغیرہ وغیرہ، یہ ایسے امور ہیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے قواعد کلیے تو ایک ہیں، لیکن ان کی صورتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان میں سے مثال کے طور پر ہم نکاح کو لیتے ہیں جس نے نکاح کے معاملے میں صرف اعلان، ڈھول بجانے اور غنا پر اکتفا کیا تو اس نے حق واجب ادا کر دیا۔ اسی طرح جس نے نکاح کے لیے گواہ اور ایجاب و قبول کو ضروری ٹھہرایا، اس نے بھی نکاح کا فرض پورا کر دیا۔ کیونکہ نکاح کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ ایک عورت کا اس طرح تعین کر دیا جائے کہ اس میں ایک مرد کے سوا کوئی دوسرا دخیل نہ ہو سکے۔ اوپر کی ہر دو صورتوں میں حاصل مراد یہی ہے۔

" یہی حال تقرب الی اللہ کا ہے۔ کبھی تو اس منزل تک انسان یوں پہنچتا ہے کہ وہ انسانی خواص کا جامہ اتار کر خدا کی ذات میں اپنے آپ کو گم کر دے۔ تقرب الی اللہ کا ایک راستہ یہ ہے کہ اپنے اعضاء و جوارح کی صحیح تربیت کی جائے۔ اور انسانی خواص کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ سے تقرب چاہا جائے۔ اسی پر ان تمام بڑے بڑے مسائل کا قیاس کر لو، جو ارتفاقات اور اقترابات کے سلسلے میں ہم نے بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ ان کی شکلیں اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

" اس سے پہلے ملت حنیفی کے نقطۂ نظر سے ہم ارتفاقات اور اقترابات کی بہت سی شکلیں پیش کر آئے ہیں۔ تم کہیں اس کی وجہ سے غلطی میں نہ پڑ جانا۔ ان کا ذکر محض مثال کے طور پر تھا۔ اس سے زیادہ اس ذکر سے ہمارا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ پھر یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ اصل حقیقت ارتفاقات

اور اقترابات کی صرف ان بیان کردہ شکلوں تک محدود ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک اس معاملے میں اصل حقیقت کا تعلق ہے، کوئی ملت یا مذہبی گروہ ایسا نہیں جو اصل حقیقت کا اعتراف نہ کرے۔ ہاں یہ اسباب ہے کہ وہ اس کے احکام کو بجا نہ لائے۔ جھگڑا اصل حقیقت کے معاملے میں نہیں ہوتا۔ نزاع اور اختلافات اس حقیقت کو مختلف شکلوں میں پیش کرنے پر پیدا ہوتے ہیں۔"

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ امام ولی اللہؒ کی تصانیف میں جس قدر قواعدِ کلیہ مذکور ہیں، وہ دراصل ان کے فلسفہ کے اساسی اصول ہیں، اور انسانیت عامہ کو اسی کی دعوت دی گئی ہے۔ اس ضمن میں جس قدر شریعت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں، وہ ان قواعد کی مثالیں ہیں۔ ان عمومی قواعد کو ان مخصوص مثالوں میں منحصر نہیں سمجھنا چاہیے۔ انسانیت کی اس اساسِ فکر پر جس کی دعوت شاہ صاحب دیتے ہیں، متدین اقوام کے عقل مند افراد ایک بین الاقوامی نقطۂ وحدت پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اور قرآن عظیم کے خصوصی قانون نے اسی بین الاقوامی سپرٹ کو صحیح اصول پر محفوظ کر دیا ہے۔

عام ذہنوں سے اس استبعاد کو دور کرنے کے لیے مولانا محمد اسماعیل شہید کی کتاب "العبقات" سے یہاں چند سطریں نقل کرنا ضروری ہیں۔ مولانا شہید مقربین کے وہبی کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے حکیم اور صدّیق کے حق میں لکھتے ہیں۔

"اس کو اگر تورات کے ماننے والوں کے درمیان مسندِ قضا پر بٹھا دیا جائے تو وہ ان میں تورات کے مطابق فیصلے کر سکتا ہے۔ انجیل والوں میں انجیل کے مطابق، اور قرآن کے ماننے والوں میں قرآن کی رو سے فیصلے کرے گا۔ بات یہ ہے کہ ہر وہ مذہب جس پر عقلمندوں کی ایک بہت بڑی جماعت جمع ہو، اور خاص طور پر ان میں ایسے لوگ ہوں جن کا غیب سے اتصال ہو۔ مثلاً عیسائی راہب، یہودی، یونانی، فلسفۂ اشراق کے ماننے والے اور ایرانی جو نور و ظلمت کو مانتے ہیں اور ہندوستان کے جوگی۔ ایسے مذہب کی حظیرۃ القدس میں ایک مخصوص اور پائیدار جگہ ہوتی ہے اور اس کی صورت اسی

سرچشمہ سے پھوٹتی ہے۔ لیکن بعد میں یوں ہوتا ہے کہ اس مذہب میں بڑے خیالات مل جاتے ہیں اور ادھر ادھر کی بیہودہ رسموں اور بے کار روایتوں کا اس میں عمل دخل ہونے لگتا ہے۔ تعبیریں اور تفسیریں غلط کی جاتی ہیں اور غیب سے جس رنگ میں علم کا فیضان ہوتا ہے، ذہن اس کو اصل کے مطابق اخذ نہیں کرتا۔ نیز بعد میں آنے والے اپنے گزرے ہوئے بزرگوں کی باتوں کو وہ معنی پہناتے ہیں، جو ان کے پیش نظر نہ تھے۔ حکیم کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سب مذاہب اور آراء کی اصل کو ادھر ادھر کی تمام ملاوٹوں سے پاک حظیرۃ القدس میں نمایاں طور پر دیکھ لیتا ہے، کیونکہ اس کی روح بیدار ہوتی ہے۔"

یہ حکیم اور صدیق دعوت و تبلیغ میں اپنی قوم کی تخصیص محض اس لئے کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنی قوم کے تعلیم یافتہ حصے کو دنیا کے سامنے عملی نمونہ بنا سکیں۔ اگر ان کی کتابیں زیادہ غور سے پڑھی جائیں تو یہ محسوس ہوگا کہ وہ اپنی قوم کے ہر فرد کو انسانیت عامہ کی تعلیم کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں ہندوستان میں دہلی ایک ایسا مرکز تھا جس میں اقوام عالم کے سب نمونے ملتے تھے اور ہر قسم کے فکری رجحانات وہاں موجود تھے۔ چنانچہ اس عہد کی دہلی میں ذہنی طور پر یہ استعداد تھی کہ وہ ایک ایسی انسانیت پرور اور عالمگیر تعلیم کا ذریعہ بنتی، جو اس کے توسط سے سارے ہند اور پھر ساری دنیا کو دی جاتی۔

دہلی کی اس فکری مرکزیت کا سنگ بنیاد بہت پہلے سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں، جو خواجہ بختیار المتوفی ۶۳۳ھ کے خلیفہ تھے، رکھ دیا گیا تھا۔ خواجہ ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۷ اور قاضی منہاج الدین طبقات ناصری صفحہ ۱۶۶ میں لکھتے ہیں۔

" سلطان شمس الدین کے عہد میں چنگیز خاں کی تباہ کاریوں سے جان بچا کر بڑے بڑے سردار اور امیر جو سالہا سال سے اپنے اپنے ملکوں میں حکومتوں کے مالک چلے آتے تھے، اور نامی گرامی علماء اور وزراء سب دہلی میں جمع ہو گئے۔ ان جلیل القدر ارباب حکومت، وزراء اور اہل علم کی نظیر دنیا میں مشکل سے مل سکتی تھی۔ ان کی بدولت التمش کا دربار محمود غزنوی اور سلطان سنجر کے درباروں کا نقش ثانی بن گیا۔

ابتدائے سلطنت ہی سے بادشاہ کی یہ کوشش رہی کہ وُہ دنیا بھر کے علماء، سادات، ملوک، امراء اور عظام وکبار کو اپنے دارالسلطنت میں جمع کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وُہ ہر سال ایک کروڑ روپیہ صرف کرتا تھا۔ اس زمانے میں دہلی میں ہر طرف سے مخلوق اُمڈ کر آگئی تھی چنانچہ التمش کے فضل وکرم سے یہ شہر دنیا بھر کے بڑے آدمیوں کا مرجع بن گیا۔"

اِس کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن متوفی سنہ ۶۸۶ھ کے عہد میں جسے بہترین زمانہ، کہا جاتا ہے، ماوراء النہر، خراساں، عراق، آذربائیجان، فارس، روم وشام کے ملوک اور شہزادے چنگیزیوں کی دست بُرد اور تُرک تاز سے بھاگ کر بلبن کے زیر سایہ دہلی میں باعزت زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ ان نوواردوں کے ناموں پہ دہلی میں پندرہ محلّے آباد ہوئے، جن کے اسماء کی تفصیل تاریخ فرشتہ صفحہ ۷۶ میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ اکنافِ عالم میں ہر فن اور ہر علم کی بے نظیر اور یگانۂ دہر ہستیاں بلبنی بارگاہ میں جمع ہوگئیں، جن کی وجہ سے دانشمندوں نے بارگاہِ بلبنی کو بارگاہ محمود سنجری پہ ترجیح دی۔

سلطان علاؤالدین خلجی اسکندر ہند متوفی سنہ ۷۱۶ھ کے عہد میں دہلی کا نقشہ امیر خسرو متوفی سنہ ۷۲۵ھ نے ان کبھی نہ بھولنے والے الفاظ میں یُوں کھینچا ہے۔

خوشا ہندوستان و رونق دیں　　شریعت را کمال عز و تمکیں
زعلم باعمل دہلی بخارا!　　زشاہاں گشتہ اسلام آشکارا
مسلماناں بہ نعمانی، روش خاص　　ز دل ہر چار آئیں را بہ اخلاص
نہ کیں با شافعی نے مہر بازید　　جماعت را و سنت را بجاں صید

آخر میں مٹنے سے کچھ ہی پہلے اسی دہلی کے متعلق شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں[1]

يَا مَنْ يُّسَائِلُ عَنْ دِهْلِيْ وَرِفْعَتِهَا　　عَلَى الْبِلَادِ وَمَا جَادَتْهُ مِنْ شَرَفِ
إِنَّ الْبِلَادَ إِمَاءٌ وَهِيَ سَيِّدَةٌ　　وَإِنَّهَا دُرَّةٌ وَالْكُلُّ كَالصَّدَفِ
فَاقَتْ بِلَادَ الْوَرٰى عِزًّا وَمَرْتَبَةً　　غَيْرَ الْحِجَازِ وَغَيْرَ الْقُدْسِ وَالنَّجَفِ
سُكَّانُهَا خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ قَاطِبَةً"　　خُلْقًا وَخَلْقًا بِلَا عُجْبٍ وَلَا صَلَفِ

---

[1] مولانا سندھی کا مرتب کردہ مسودہ "کتاب التمہید" سے یہ بیان آثار الصنادید مصنفہ سرسید سے ماخوذ ہے۔

بِهَا مَدَارِسُ لَوْ طَافَ الْبَصِيرُ بِهَا   لَمْ تَنْفَتِحْ عَيْنُهُ إِلَّا عَلَى الصُّحُفِ
كَمْ مَسْجِدٍ زُخْرِفَتْ فِيهَا مَنَارَتُهُ   لَوْ قَابَلَتْهُ الشَّمْسُ الضُّحَى تَنْكَسِفُ
لَا غَرْوَ إِنْ زَانَتِ الدُّنْيَا بِزِينَتِهَا   كَمْ مِنْ أَبٍ قَدْ عَلَا بِابْنٍ ذِي شَرَفٍ
وَمَاءُ جَوْنٍ جَرَى مِنْ تَحْتِهَا مَحْكِي   أَنْهَارُ خُلْدٍ جَرَتْ فِي أَسْفَلِ الْغُرَفِ

اے دہلی کی رفعت اور اس کی عظمت وشان کے متعلق سوال کرنے والے سُن۔

دوسرے شہر اور بلاد کنیزیں اور لونڈیاں ہیں اور دہلی مالکہ اور رانی۔ یہ موتی ہے اور باقی سب کے سب سیپیاں۔

کیا بلحاظ عزت اور کیا بلحاظ مرتبہ کے۔ دہلی سب شہروں کی سرتاج ہے۔ البتہ سرزمینِ حجاز، بیت المقدس اور نجف اشرف اس سے مستثنیٰ ہیں۔

دہلی کے رہنے والے شکل وشباہت میں اور اخلاق واطوار میں دنیا جہاں والوں سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔ نہ ان میں خود پسندی ہے، اور نہ کبر وغرور۔

جس طرف نکل جایئے، اس میں مدارس نظر آئیں گے، اور وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوگا۔

دہلی کی مسجدیں اس شان کی ہیں کہ ان کے مناروں کی آب وتاب کے مقابلہ میں جب نصف النہار کا سورج آتا ہے تو وہ بھی مارے شرم کے چندھیا جاتا ہے۔

اگر دہلی کی زیب وزینت کی وجہ سے ساری دنیا دمک اُٹھی ہے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ بیٹے اگر ہونہار اور قابل ہوں تو باپ دادا کا نام روشن ہی ہوا کرتا ہے۔

دہلی کے نیچے دریائے جمنا یوں بہہ رہا ہے جیسے یہ خلد بریں کی کوئی نہر ہے جو بہشت کے بالاخانوں کے نیچے بہہ رہی ہے۔

۱۸۵۷ء میں جب دہلی بالکل مٹ گئی تو اس کی مٹی ہوئی عظمت میں بھی ایسی ایسی نادر روزگار شخصیتیں باقی رہ گئی تھیں، جن سے بعد میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کی شمع جلی۔ دیوبند میں قدیم علوم وفنون

نے نیا جنم لیا۔ نیز اردو نثر میں سرسید، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور شعر و نظم میں غالب، حالی، داغ دہلی کی اسی عظمتِ رفتہ کی یادگاریں تھیں جن کے فیض سے جلی ہوئی کھیتیوں کو پھر لہلہانے کا موقع ملا۔

بے شک محمد شاہ کے دَور میں دہلی کی سیاسی حیثیت سلطنت کے عام زوال کی وجہ سے بہت گر چکی تھی۔ لیکن ذہنی اور فکری اعتبار سے دہلی کو ابھی گہن لگنا شروع نہیں ہوا تھا۔ امام ولی اللہ نے اس دہلی کے اربابِ فکر کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا تھا اور وُہ دہلی کے اعلیٰ طبقہ کو متاثر کرنے میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس کے لیے دو تاریخی شہادتیں کافی ہیں۔ مرزا محمد جانجاناں فرماتے ہیں "حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے نیا طریقہ بیان فرمایا ہے اور اسرارِ معارف اور علوم کی گہرائیوں کی تحقیق میں ان کی اپنی خاص طرز ہے۔ موصوف ان علوم و کمالات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ علمائے ربّانی میں سے ہیں۔ ان جیسے محقق صُوفی کہ جو ظاہر و باطن کے علوم کے جامع ہوں اور انہوں نے نئے علوم بھی بیان کیے ہوں، عہدِ گزشتہ میں بہت کم گزرے ہیں[الف]"

شاہ ولی اللہ کی دعوت کی مقبولیت کی دوسری شہادت محمد شاہ کے دربار کا فیصلہ ہے۔ محمد شاہ امام ولی اللہ کے مدرسہ کو پرانی دہلی کے اس چھوٹے سے احاطے میں دیکھنا نہیں چاہتے، بلکہ وُہ شاہجہان آباد کا ایک پورا محلہ اس کے لیے خاص کر دیتے ہیں۔ یہی مدرسہ آگے چل کر ولی اللہی تحریک کا مرکز بنتا ہے۔ امام ولی اللہ، ان کے بعد امام عبد العزیزؒ اور پھر امام محمد اسحاق نے اسی مدرسہ میں بیٹھ کر اس تحریک کی رہنمائی کی، جس کے پیشِ نظر سلطنتِ دہلی کی تجدید تھی۔ اسی مدرسہ کے نمونے پہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ولی اللہی تحریک کے دوسرے دَور میں مدرسہ دیوبند[ب] بنایا گیا۔

حکیم الہند نے اپنے پروگرام کی تدوین کے ساتھ ساتھ رفقاء کی مرکزی جماعت بھی تیار کی جو تعلیم و ارشاد کے ذریعہ اس انقلابی تحریک کی اشاعت ایک طرف صوفیہ اور علماء میں اور دوسری طرف امراء و سرداران سلطنت میں کرتی رہی۔ ان میں سے مولانا محمد عاشق پھلتیؒ، مولانا نور اللہ بڈھانوی اور مولانا محمد امین کشمیری خاص طور پہ مشہور رہیں۔ نیز آپ نے اطرافِ ملک میں اس مرکزی جمعیت کی شاخیں قائم

[الف] کلمات طیبات صفحہ ۸۳، ۸۴، [ب] تفصیل بعد میں آئے گی

کرائی۔ نجیب آباد کا مدرسہ اور رائے بریلی میں دائرہ (تکیہ) شاہ علم اللہؒ حکیم الہند کی مرکزی تحریک کے مرکز تھے۔ سندھ میں ملا محمد معینؒ کا مدرسہ ٹھٹھہ بھی اُن کا ایک مرکز تھا، جس سے مشہور عارف شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔

ہم شاہ صاحب کے الہامی خواب کا، جو آپ نے مکہ معظمہ میں ۱۱۴۴ھ میں دیکھا تھا، پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اس خواب میں حکیم الہند نے دیکھا تھا کہ ملک الکفار مسلمانوں کے شہروں پر قابض ہو گیا ہے۔ اس خواب کا مشاہدہ بعد میں شاہ صاحب کو یوں کرایا گیا کہ لال قلعہ پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا۔ پھر آپ نے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ میں قائم الزمان ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ذریعہ بنایا گیا ہوں۔ تیس سال بعد ۱۱۷۴ھ میں معرکہ پانی پت میں اس خواب کی تعبیر عمل میں آئی۔ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے اور شاہ صاحب ہی کے مشورہ پر انہوں نے اور ان کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو بلایا تھا۔ اس طرح شاہ صاحب نے دہلی کی حکومت کے اشتراک سے اپنے پروگرام کا ایک حصہ مکمل کر لیا۔ چنانچہ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کی کامیابی نے دہلی کے سیاسی افق کو مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے خطرات سے محفوظ کر دیا۔ اس واقعہ کے دو برس بعد ۱۱۷۶ھ یعنی ۱۷۶۳ء میں امام ولی اللہ نے وفات پائی۔

ہمارے اہل علم حکیم الہند کی تصانیف اگر غور سے پڑھیں تو اُن پر شاہ صاحب کے مخصوص نظریات واضح ہو جائیں گے۔ شاہ صاحب کے وہ افکار جو پہلی ہی نظر میں ان کی تصانیف میں سے آشکارا ہو جاتے ہیں، ہم ان میں سے نمونہ کے طور پر پانچ کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔

(۱) قرآن عظیم ایک انقلاب آفریں نظام کی دعوت دیتا ہے۔ یہ انقلاب آفریں نظام بین الاقوامی اور ساری انسانیت پر شامل ہے۔ رہتی دنیا تک جب بھی مسلمانوں کی کوئی جماعت اس پر عمل کرے گی تو اس سے وہی نتائج پیدا ہوں گے جو تاریخ اسلام کے دورِ اوّل یعنی خلافت راشدہ میں دنیا نے دیکھے۔ یہ قرآن کی تاثیر ہے۔ کسی آدمی یا زمانے کی تخصیص لغو ہے۔

مسیحی دنیا قرآن کی اس تاثیر کو عام نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے برابر کوشاں رہتی ہے۔

مصر کے مشہور عیسائی مؤرخ اور مصنف جرجی زیدان نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت کا نظام محض بخت و اتفاق کا نتیجہ تھا۔ یعنی عہد گزشتہ میں اسلام کے عظیم الشان انقلاب کا باعث قرآن کی تعلیمات نہ تھیں۔ اتفاق سے چند افراد ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے ایک بار ایسا کر دکھایا۔ لیکن یہ کہ ہمیشہ یوں ہو غلط ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کے دُوررس انقلابی اثرات کو زائل کرنے کے لیے اور بھی حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔

زمانۂ حال میں مجالس ہائے سیرت کا نظام بھی اس قسم کا ایک خواب اور نشہ ہے، جو عوام مسلمانوں کو پلایا جا رہا ہے۔ تحریک چلانے والے یہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، مگر جن لوگوں نے ان کو یہ لقمہ دیا، ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دماغوں میں یہ خیال جمالیں کہ اسلام کی تمام اثر آفرینی قرآن کے بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شخصیت میں مضمر ہے۔ اگر آئندہ بھی کوئی ایسی شخصیت بروئے کار آ گئی تو ممکن ہے کہ یہ اثر دوبارہ پیدا ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت انتظارِ مہدیؑ میں بیٹھی ہے۔

(۲) قرآن کی تعلیمات کے اثر سے مسلمانوں میں جو اجتماعی تحریک عالمِ وجود میں آئی، وہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے شروع ہو کر حضرت عثمان کے عہدِ خلافت میں شورش کے زمانہ تک منزہ اور اپنی اصلی حالت میں جاری رہی۔ قرآن حکیم کی عملی تفسیر کے طور پر اس اجتماعی تحریک کو جاننا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے۔ اسی شہر میں اسلام کی اجتماعی تحریک نے ایک مستقل نظام کی شکل اختیار کی۔ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں مدینہ ہی اسلام کی تحریک کا مرکز و مصدر بنا رہا۔ بعد میں جب مسلمانوں میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں، حضرت علی نے مدینہ کے بجائے کوفہ کو اپنا سیاسی مرکز بنایا۔ اور ان کے بعد امویوں نے دمشق میں اپنا دارالخلافت منتقل کر لیا، تو پھر بھی اسلام کی دینی اور فکری مرکزیت مدینہ ہی میں رہی۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کے اثر و تاثیر سے جو نظامِ اجتماع معرضِ وجود میں آیا، اس کے اساس و مبادی اور تعلیمات اہلِ مدینہ کے ہاں محفوظ رہیں۔ بعد میں ان کو امام مالک نے اپنی کتاب مؤطا میں مدون کر دیا اس لئے امام مالک کی مؤطا کو حدیث و فقہ کی تمام کتابوں پر مقدم ماننا چاہیئے۔

ایضاً۔ مسلمانوں میں دینی تعلیم اجتماعی طور پر مدینہ منورہ سے پھیلنا شروع ہوئی باقی حاشیہ صفحہ ۴۸ پر

(۳) قرآن نے اس آیت هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَ لَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ ۞ (توبہ-۳۳) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ (اس (دین) کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے، اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں") میں تمام ادیان پر جس غلبہ کا دعویٰ کیا ہے، وہ خلافت راشدہ کے اس دور اوّل میں پورا ہو چکا ہے۔ یہ خیال کہ قرآن کا یہ دعویٰ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے، صحیح نہیں۔ اور اس کے لیے کسی نبی یا ولی کا انتظار غلط ہے۔

اس سلسلے میں فرقہ شیعہ نے اہل بیت کے نام سے غلط پروپیگنڈا کر کے مسلمانوں کی ذہنیت کو جس بڑی طرح سے مسموم کر دیا تھا، حکیم الہند اپنی تصانیف میں اس کا تدارک فرماتے ہیں۔

(۴) حکیم الہند دنیا اور آخرت کی فلاح کا سارا دار و مدار ان چار بنیادی اخلاق[۱-۴] کو قرار دیتے ہیں۔ طہارت[۱] یعنی پاکیزگی، اعلیٰ و برتر ذات خداوندی کے حضور میں خشوع و خضوع[۲] سماحت[۳] یعنی ضبط نفس۔ عدالت[۴]۔ ان چار اخلاق میں مرکزی حیثیت عدالت کو ہے۔ کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احتراز کلی نہ برتا جائے۔ نزول قرآن کے زمانے میں کسریٰ و قیصر[۵] نے متمدن دنیا کے اکثر حصے کو اقتصادی پریشانی میں مبتلا کر کے اخلاق سے محروم کر دیا تھا، اس لئے قرآن عظیم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ کسریٰ و قیصر کا زور توڑ کر ایسا نظام نافذ کر دیا جائے جس سے اقوام عالم کو اس مصیبت سے نجات حاصل ہو۔

۵۔ قرآن عظیم کی اس انقلابی دعوت کو زندہ کرنے کا ارادہ جب کسی مسلم سوسائٹی میں پیدا ہو تو اس

(بقیہ حاشیہ) اور حضرت عثمانؓ کی شہادت تک یہ تسلسل قائم رہا۔ اس خاص معاملے میں مدینہ طیبہ کا مقابلہ نہ تو مکہ معظمہ کر سکتا ہے اور نہ بصرہ و کوفہ و بغداد۔ اس اساس پر ہم موطا امام مالک کو قرآن شریف کے بعد اوّل درجہ پر اسلامی روایات کا مجموعہ مانتے ہیں، ہم امام بخاری، مسلم، داؤد، ترمذی وغیرہ ان محدثین کے بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے موطا کی اس شان کو برقرار رکھا، اور دوسرے دور میں اپنی اصطلاحات کے مطابق موطا کو اوّل درجہ کی کتاب ثابت کر دیا۔

کے لئے ضروری ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرفائے قریش کے وہ خاندان جو مہاجرین اولین ہونے کا شرف حاصل کر چکے ہیں، وہ ان کی ذہنیت، ان کی معاشی حالت اور ان کی معاشرتی سیرت کو اپنا امام بنائے۔

مسلمانوں میں اس انقلابی روح کو پیدا کرنے کے لئے حکیم الہند عربی زبان اور عرب[1] اوّل کی سیرت کو ایک معیار قرار دیتے ہیں۔ اس سے ان کا یہ مطلب نہیں کہ اگر سفہاءِ عرب جاہلیت کو زندہ کر رہے ہوں تو اس صورت میں بھی انہیں کی تقلید کی جائے۔

حکیم الہند کے اس چوتھے اصول کو کہ "کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احترازِ کلّی نہ برتا جائے" ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکے، جب تک ہم نے یورپ میں جا کر سوشلزم کا مطالعہ نہیں کر لیا۔ جن رفقاء نے ہمیں اس مطالعہ میں مدد دی، وہ عموماً کارل[2] مارکس کے متبع تھے۔ اس کے احترام میں ہمارے یہ رفقاء اس قدر مبالغہ کرتے، جس سے ہمیں تکلیف ہوتی۔ اس احترام اور فضیلت کا مدار وہ کارل مارکس کے اقتصادی نظام کو بتاتے ہیں۔ ہم حیران رہ گئے جب اس قسم کے انقلابی پروگرام کے تمام حصے ہم نے حکیم الہند کی

---

[1] عرب قوم کا اتباع اور چیز ہے۔ اور عرب اوّل کے انقلابی طبقے کا اتباع بالکل دوسری چیز ہے۔ انقلاب پیدا کرنے کے لیے انقلابی سیرت سامنے رکھنی چاہیئے۔ قریش میں سے مہاجرین کا طبقہ اپنے شہر کا حاکم تھا۔ انہوں نے گھر بار چھوڑا، اپنی حکومت کو خیر باد کہا۔ پردیس میں جا کر اپنی محنت سے نئے گھر بنائے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ قرآن کے انقلاب کو کامیاب بنا سکیں۔ مہاجرین کی یہ سیرت قرآن سمجھنے کے لئے شمع ہدایت بن سکتی ہے لیکن ایک شخص اپنے گھر کا دلدادہ ہے اور چاہتا ہے کہ قرآن بھی سمجھے ع این خیال است و محال است و جنوں

ہم نے جب یورپ کے انقلابیوں کی اولوالعزمی دیکھی تو ہمیں اس کے مقابلے میں اپنی قوم کی ذہنی پستی کو دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا مگر ہم اپنے نوجوانوں سے مایوس نہیں ہیں۔ البتہ پیران پارسا کو ہم کوئی درجہ نہیں دے سکتے۔

[2] کارل مارکس مئی ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸۳ء میں اس نے وفات پائی۔ اس کا اشتراکی مینی فیسٹو

"بقیہ حاشیہ آگے"

تصانیف میں جو کارل مارکس سے بہت پہلے گزرے ہیں نہایت بسط سے مدون پائے۔ امام ولی اللہ ۱۷۶۲ء میں فوت ہوئے اور کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔

بقیہ حاشیہ:۔ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ اور اس کی قائم کردہ پہلی انٹرنیشنل کا اجلاس ۱۸۶۴ء میں منعقد ہوا جس میں اس کے پروگرام کا پہلی مرتبہ تعارف کرایا گیا۔ اس حساب سے شاہ ولی اللہ صاحب رح پہلی انٹرنیشنل سے ۱۰۲ سال پیشتر اور مارکس کے اعلان اشتراکیت کی اشاعت سے ۸۵ سال پیشتر وصال فرما چکے تھے۔

سراج الہند امام عبدالعزیز

۱۱۷۶ھ ——— ۱۲۳۹ھ

جب حکیم الہند امام ولی اللہ فوت ہوئے تو شاہ عبدالعزیز اس وقت سترہ برس کے نوجوان تھے اور ابھی طالب علمی سے فارغ نہیں ہوئے تھے۔ امام ولی اللہ کی مرکزی جمعیت نے شاہ عبدالعزیز ہی کو حزب ولی اللہ کا امام بننے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے امام ولی اللہ کے طریقہ پر شاہ عبدالعزیز کی علمی تکمیل کی طرف توجہ کی گئی مولانا محمد عاشق اور مولانا محمد امین نے علم حدیث اور ولی اللہی انقلابی تحریک کے اصول میں اور مولانا نور اللہ جو مولانا عبدالعزیز کے خسر بھی تھے، فقہ میں ان کی علمی تربیت مکمل کی۔ اور انہیں امام عبدالعزیز کے درجہ تک پہنچایا۔

مولانا محمد عاشق، مولانا محمد امین کشمیری اور مولانا نور اللہ یہ تینوں کے تینوں امام ولی اللہ کے تربیت یافتہ مخصوص "راسخین فی العلم" گروہ کے سرکردہ بزرگ تھے۔ ان کے ذریعہ شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم محفوظ ہوئے اور پھیلے، ان کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگردوں کا ایک دوسرا طبقہ بھی پیدا ہوا، جس میں ان کی اولاد بھی داخل ہے۔ امام عبدالعزیز ان دونوں طبقوں کے مسلمہ امام ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے خواص شاگردوں سے اگر دس آدمیوں نے استفادہ کیا تو

شاہ عبدالعزیز کے خواص شاگردوں سے دس ہزار مستفید ہوئے۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تو دہلی کی اسلامی سلطنت میں ایک حد تک ابھی جان باقی تھی۔ لیکن شاہ عبدالعزیز کے عہد میں تو رہی سہی جان بھی ختم ہوگئی۔ اُس وقت خاص دہلی میں انگریزی ریزیڈنٹ موجود تھا۔ اور ظاہر ہے انگریزی حکومت شاہ ولی اللہ ان کے علوم اور ان علوم سے آگے چل کر جو نتائج مرتب ہونے کا امکان تھا، ان سے ناواقف نہ تھی۔ لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ کے علوم کو جس طرح بھی ہو سکا، عام اہل علم تک پہنچا دیا۔

امام عبدالعزیز نے یہ کیا کہ ان کے زمانے میں عام علماء جن علوم سے زیادہ مانوس تھے، موصوف نے خود بھی ان علوم میں خاص دلچسپی لی۔ آپ مروجہ درسی کتابوں میں جو اقوال شاہ ولی اللہ کی تحقیق کے خلاف پاتے، ان پر بڑی لطافت سے بتدریج جرح کرتے جاتے اور آخر میں بہت ہلکے الفاظ میں شاہ ولی اللہ کا قول نقل کر دیتے۔ اس طرح ولی اللہی فکر آسانی سے دماغ میں جذب ہو جاتا۔ لیکن آپ اس قول کو نہ اپنی طرف منسوب کرتے اور نہ شاہ ولی اللہ کی طرف۔ اس طرح آپ عام اہل علم میں اتنی استعداد پیدا کر دیتے تھے کہ وہ امام ولی اللہ کی تحقیقات کو سمجھ سکیں۔ اس کی مثالیں آپ کی تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" اور "تفسیر عزیزی" میں کثرت سے ملتی ہیں۔ لیکن اپنے خواص اہل بیت کو اور جو اور بھی ان کے زمرہ میں شریک ہو سکا آپ نے خاص طور پر شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا محقق بنا دیا۔ اس طرح امام عبدالعزیز نے کم از کم ساٹھ برس تک کام کیا۔ یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ کا علم اور ان کی حکمت لوگوں کے ذہنوں میں راسخ ہوگئی۔ اگر اس وقت یورپ کی ایک بڑی عقل مند انقلابی حکومت ہندوستان میں پاؤں نہ جما چکی ہوتی تو شاہ عبدالعزیز کے علوم کا آج یہاں اقتدار ہوتا۔ لیکن یہ یورپی حکومت صرف شاہ عبدالعزیز کے علوم کے برگ و بار لانے میں سدِ راہ ثابت نہ ہوئی بلکہ اس کی تدبیروں نے ان علوم کی صورت کو اس طرح مسخ کیا کہ عوام ان سے متنفر ہو گئے۔ البتہ جن لوگوں میں علمی ذوق موجود تھا۔ وہ اس مخالف پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز نے ایک طرف تو حکیم الہند کے علوم و حقائق کی اشاعت کی۔ دوسری طرف

ان کا مقصدِ حیات یہ بھی تھا کہ شاہ ولی اللہ کی انقلابی دعوت کو ہندوستان میں عملی جامہ پہنائیں۔ شاہ ولی اللہ کو الہام کیا گیا تھا کہ "جو چیزیں تمہیں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے ان کے لیے کافی صبر کی[الف] ضرورت ہے۔" اس کام کو پورا کرنا شاہ عبدالعزیز کا مقصد تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے ساتھ اُن کے اپنے بھائی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر بہترین معاون ثابت ہوئے۔ عقلی مسائل کے لیے جس قدر تحقیق کی ضرورت ہوتی، اس کو شاہ رفیع الدین پورا کرتے رہے۔ کشفی مسائل میں خصوصیت کے ساتھ شاہ عبدالقادر ممتاز تھے۔ نقلی علوم کی تعلیم شاہ عبدالعزیز کے اپنے ذمہ تھی۔ اس طرح علم کے تینوں ذرائع یعنی عقل، نقل اور کشف کی مدد سے ایک جامع سوسائٹی پیدا کرنے کی کوشش جاری رہی۔

اسی زمانے میں امام عبدالعزیز نے امام الانقلاب امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو خواب[۱۲] میں دیکھا۔ امیر المومنین نے انہیں یقین دلایا کہ عام طور پر فقہا اور صوفیہ کے مروجہ طریقے افراط و تفریط سے خالی نہیں۔ لیکن قرونِ اولیٰ کے مطابق صرف وہی طریقہ ہے جس کی دعوت امام ولی اللہ دیتے ہیں۔ امیر المومنین نے ان کی قلبی کیفیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، جسے امام عبدالعزیز بیداری میں بھی اپنے اندر مستقر پاتے تھے۔ امیر المومنین نے انہیں پشتو زبان بھی سیکھنے کی طرف توجہ دلائی۔

شاہ عبدالعزیز حقیقت میں ولی اللہی تحریک کے سلسلے کے پہلے امام ہیں، جنہوں نے حکیم الہند شاہ ولی اللہ کے اصول پر قومی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ شاہ ولی اللہ نے دہلی کے اعلیٰ طبقہ کو اپنے علوم سے متعارف کیا تھا اور امرا نے سلطنت کے اشتراک سے کسی قدر سیاسی کامیابی بھی حاصل کر لی تھی۔ یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اور شاہ صاحب ہی کے مشورے سے انہوں نے اور اُن کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو قندھار سے بلایا تھا۔ اصل میں احمد شاہ ابدالی کو بلانے میں شاہ صاحب کی روحانیت کام

[الف] تفہیمات صفحہ ۱۲ سطر ۱۲ کی رُوح یہ ہے کہ ان کو پشتونوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اس سے پہلے شاہ ولی اللہ اپنی کتاب "خیر کثیر" صفحہ ۱۱۳ میں لکھ چکے ہیں کہ حکومت چلانے کی استعداد مسلمانانِ ہند سے افاغنہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے۔ اس سے ان کی مراد جنگی طاقت اور حربی قوت ہے۔ جس قوم سے لڑنے مرنے کی طاقت سلب کر لی گئی ہو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

کر رہی تھی اور نواب نجیب الدولہ اس میں ایک واسطہ بنے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے سلطنت دہلی کا نظام اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ امرائے حکومت میں سے کوئی بھی اس قابل نہ نکلا جو پانی پت کی فتح سے فائدہ اٹھاتا اور ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے مرکز کو انتشار اور تباہی سے بچا لیتا۔ البتہ بعض ارکان دولت نے اتنا کر لیا کہ چند صوبوں کی حکومتیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ ان چند ریاستوں کے سوا ہندوستان کے باقی حصوں پر مسلمانوں کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔

بے شک احمد شاہ ابدالی کی یلغار سے مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا اور پانی پت میں شکست کھانے کے بعد ان میں اتنی سکت نہ رہی کہ وہ اکبر اور عالمگیر کے تخت کے مالک بننے کی دوبارہ خواہش کر سکتے۔ لیکن اس عرصے میں انگریز بڑی سرعت سے قوت پکڑ رہے تھے۔ انہوں نے بنگال اور مدراس پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی ہند کی طرف توجہ کی۔ بکسر کی لڑائی میں، جو ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو ہوئی، شاہ عالم ثانی انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ بادشاہ نے ان سے معاہدہ کیا جس کی رو سے تمام قلمرو کی نظامت کمپنی کو سپرد کر دی گئی۔ اور بادشاہ کے لیے قلعہ، اطراف دہلی تا حدود قطب صاحب کا علاقہ مخصوص کر دیا گیا۔ کمپنی گویا جگزار قرار دی گئی۔ مگر عملاً یہ قرار پایا کہ "ملک بادشاہ کا اور حکم انگریز کا"۔ مسلمانوں کے لیے خصوصاً اور عام ہندوستانیوں کے لیے عموماً رعایتیں رکھی گئیں، مثلاً یہ کہ حکومت کی زبان فارسی رہے گی۔ مسلمانوں کے مقدمات کا قاضی فیصلہ کریں گے، اور ہندوؤں کے مقدمات کا پنڈت۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم فوت ہوا اور اس کی جگہ اکبر ثانی بادشاہ بنا تو انگریزوں نے نئے بادشاہ کے حلقۂ اثر کو اور بھی تنگ کر دیا۔ چنانچہ اس کی حکومت صرف قلعہ دہلی اور حدودِ شہر تک محدود کر دی گئی اور باقی تمام ہندوستان کو کمپنی نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس طرح دہلی سے لے کر کلکتہ تک کے علاقوں پر انگریزوں کا ایک لحاظ سے عملی تسلط ہو گیا۔ دہلی سے شمال کی طرف کے جو صوبے تھے وہ ایک زمانہ ہوا ہندوستان کے مرکز سے پہلے ہی کٹ چکے تھے، چنانچہ امام ولی اللہ کے وقت میں نادر شاہ نے کابل، قندھار اور ٹھٹھہ کو ایران سے ملحق کر لیا تھا۔ اس سے پہلے قندھار کی افغانی حکومت جو ۱۷۰۹ء سے شروع ہوئی تھی، محمد شاہ کو اپنا بادشاہ مانتی تھی۔ نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے کشمیر، لاہور

اور ملتان کے صوبے بھی دہلی سے چھین لیے۔ اس طرح یہ چھ صوبے دہلی کی حکومت سے الگ ہوگئے۔ ہم قندھار کی اس افغانی حکومت کو بھی ہندوستانی حکومت مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی وہی حیثیت تھی جو نظامِ دکن کی حکومت کی تھی۔[۲۰]

۱۱۷۰ھ کے قریب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ قبضہ زیادہ عرصہ تک نہ رہا۔ ۱۸۰۰ھ میں احمد شاہ کا پوتا زماں شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے لاہور فتح کیا۔ وہ دہلی کی طرف کوچ کرنے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا کہ انگریزی ڈپلومیسی نے اپنا کام کیا اور افغانستان پر ایران کی جانب سے حملہ کرا دیا۔ ناچار شاہ زماں کو لدھیانہ سے واپس کابل کی طرف جانا پڑا۔ اس رواروی میں وہ رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر بنا آگیا۔ یہی رنجیت سنگھ ہے جس نے رفتہ رفتہ ۱۸۰۸ء یعنی ۱۲۲۳ھ میں پنجاب، ملتان، کشمیر اور پشاور پر قبضہ کر کے ایک مستقل سکھ حکومت کی بنا ڈالی اور انگریزوں سے مصالحانہ معاہدہ کیا۔

الغرض امام عبدالعزیز کے زمانے میں ایک طرف کلکتہ سے لے کر دہلی تک انگریز عملی لحاظ سے مسلط ہو چکے تھے۔ دوسری طرف دکن میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ زوروں پر تھے۔ ان کے مقابلے میں لکھنؤ، حیدرآباد اور پھر میسور کی مسلم حکومتیں تھیں جو سلطان دہلی کا احترام کرتی تھیں۔ ہمارے خیال میں شاہ عبدالعزیز کے پروگرام کا بھی وہی خاکہ تھا جس پر امام ولی اللہ پہلے عمل کر چکے تھے۔ آپ نے مرہٹوں کے تغلّب کو دُور کرنے کے لیے نواب نجیب الدولہ کے ذریعہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی تھی۔ اب شاہ عبدالعزیز کے عہد میں پنجاب پر سکھ قابض ہو چکے تھے، اور خاص دہلی میں انگریز آگئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے پیشِ نظر یہ تھا کہ وہ کابل اور قندھار کی طاقت کو دعوت دے کر دہلی بلائیں۔ اگر وہاں کے امراء ناقابل ثابت ہوں تو عام لوگوں میں سے جو لائق افراد میسّر آئیں، ان سے مدد لی جائے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ کابل اور قندھار کے ان نواح میں امارت قائم کی جائے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس زمانے میں ہندوستان کی مسلمان اقوام میں سے صرف افغانوں میں جنگی طاقت اور حربی قوت موجود تھی۔ وہ لڑنا بھی جانتے تھے اور مردانگی اور شجاعت کے جوہر بھی رکھتے تھے۔ ان کو اگر منظم کر دیا جاتا تو اسلامی قومی حکومت کے لیے ایک مضبوط فوج فراہم ہو سکتی تھی۔

یہ حالات تھے، جن میں امام عبدالعزیز نے اپنے آپ کو گھرا ہوا پایا۔ ظاہر ہے اُن کو انہی حالات کے مطابق اپنے لیے راہِ عمل نکالنی تھی۔ چنانچہ امام عبدالعزیز نے اپنے کام کو جس خوش تدبیری سے انجام دیا، اس کو دیکھ کر آپ کے کمال کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ مختصر الفاظ میں آپ نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ عوام مسلمانوں میں اسلامی عقائد و اخلاق کے متعلق جو غلط فہمیاں رائج ہو چکی تھیں، ان کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی۔ عملاً اس کا مطلب یہ تھا کہ عوام دوسرے مُرشدوں اور عالموں کو چھوڑ کر شاہ صاحب کے گرد جمع ہوتے اور تحریک کی ترقی میں مخالف گروہوں کے لوگ دخل انداز نہ ہو سکتے۔ یہ امام عبدالعزیز کے پروگرام کا پہلا درجہ تھا۔ دوسرا درجہ یہ تھا کہ آپ نے انقلابی دعوتِ عام کے لیے ایک مرکز بنایا جس کے ارکان اسمٰعیل شہید سید احمد شہید اور مولانا عبدالحی تھے اور شاہ محمد اسحاق کو اپنی جگہ مقرر کیا۔ ہماری سمجھ میں اس نئی حزب کے امیر شاہ محمد اسحاق تھے، سید احمد شہید امیر الدعوت اور امیر الجہاد تھے۔ امام عبدالعزیز کا اس سے مقصد یہ تھا کہ آگے چل کر یہ جماعت دہلی کی سلطنت کی کمزوری کو دُور کرنے کے لیے برسرِ کار آئے۔ یوں کہیے کہ اس جماعت کی حیثیت حکومت مؤقتہ (PROVISIONAL GOVERNMENT) کی تھی۔ بظاہر دہلی کی فضا اس کے لیے سازگار نظر نہ آتی تھی، اس لیے لامحالہ اس جماعت کا افغانی علاقہ میں جانا ایک لازمی امر تھا۔ افغانوں میں چونکہ ایک سیّد کی امارت بہت جلد مقبول ہو سکتی ہے۔ اس غرض کے پیشِ نظر سید احمد شہید کو امیرِ جماعت مقرر کیا گیا اور مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی ان کے وزیر تجویز ہوئے۔

یہ ہے امام عبدالعزیز کے ساٹھ سال کی دعوت و عمل کا ایک مختصر سا خاکہ۔ موصوف نے بتدریج اس کام کو کس طرح چلایا، اب اس کی تفصیلات سنیے۔

امام عبدالعزیز نے سب سے پہلے فتویٰ دیا[الف] کہ ہندوستان کے جس قدر حصے غیر مسلم طاقت کے قبضہ میں جا چکے ہیں، ان علاقوں میں اگرچہ برائے نام سلطانِ دہلی کا عمل دخل مانا جاتا ہے، لیکن وہ سب کے سب دارالحرب ہیں۔ امام عبدالعزیز کے نزدیک چونکہ سلطانِ دہلی کی برائے نام حکومت ملک کو دارالاسلام

[الف] اس فتوے کی تفصیل کے لیے فتاویٰ عزیزیہ جلد اول مطبع مجتبائی صفحہ ۱۷ و ۱۸۵ ملاحظہ ہو۔

نہیں بنا سکتی، اس لیے ہندوستان میں مسلمانوں کی جو زبردست قوتیں موجود ہیں، ان کا فرض ہے کہ وُہ یا تو یہاں سے ہجرت[الف] کر جائیں۔ یا دشمن سے لڑ کر اپنی نئی اسلامی حکومت بنائیں۔ ہر وُہ شخص جو دارالحرب میں رہتا ہو، اس کا یہ مذہبی فرض ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اسلامی حکومت کا نظام دشمنوں کی غالب طاقت کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو تو یہ فرض عام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ ملّت اسلامیہ کا اس سے تغافل برتنا اور اس معاملے میں کچھ نہ کرنا شریعت کی نظر میں حرام ہے۔ جب یہ حالت ہو تو مسلمانوں کے ہر ہر فرد پر واجب ہے کہ وُہ دشمنوں کے غلبے کو ختم کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرنے کا ارادہ کرے۔ اور پھر جیسے جیسے حالات پیش آتے رہیں، اسی لحاظ سے اجتماعی نظام قائم کرتا رہے۔

امام ولی اللہ نے تو دہلی کے اعلیٰ طبقے کو اپنے علوم و افکار سے متعارف کرایا تھا، مگر امام عبدالعزیز نے قوم کے متوسط طبقے کو بیدار کر کے عوام کو اس حقیقت سے آشنا کیا۔ یہی قومی حکومت کی تاسیس ہے۔ بفضلہ تعالیٰ امام عبدالعزیز اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور اسی بنا پر سراج الہند کہلائے۔ تاریخِ اسلام میں اسی قسم کا ایک واقعہ گزر چکا ہے، جسے تاریخ نے امام عبدالعزیز کے زمانے

[الف] ہجرت کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جہاں تک ہندوستانی مسلمان کا تعلق ہے، وُہ سرے سے ہندوستان چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہاں کی اکثر آبادی ہندوؤں سے مسلمان ہوئی ہے۔ باقی رہے ان کے مرشد اور استاد، بے شک وُہ باہر سے آئے اور گو مسلمان بادشاہوں نے یہاں اپنے خاندان چھوڑے مگر ایسی حالت میں کہ اب ان کے پاس حکومت نہیں رہی اب یہ تینوں (استاد، مرشد، خاندان شاہی) طبقے ایسے ہیں جو ہندوؤں سے مسلمان نہیں ہوئے لیکن ان کو اپنا ملک چھوڑے اتنا زمانہ گزر چکا ہے کہ انہیں وطن میں کوئی شخص نہیں پہچانتا۔ ایک سید اگر مکہ معظمہ میں جائے تو عام ہندوستانی کی طرح سمجھا جائے گا۔ یہی حال افغانوں کا افغانستان میں اور ترکوں کا ترکستان میں ہے۔ ہمارے سامنے شریف افغان خاندانوں سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ ہندوستانی نوجوان کابل میں آئے تاکہ وہاں اپنی قومی حکومت کی ترقی میں مدد دیں، مگر وُہ عام ہندوستانیوں سے بھی زیادہ ذلیل ہو کر واپس آ گئے۔ لہٰذا ہم نہیں مانتے کہ کوئی ہندوستانی مسلمان ہندوستان سے ہجرت کی استعداد رکھتا ہے، اس لیے ان کا فرض یہی ہو گا کہ دارالحرب میں رہ کر اسکو دارالاسلام بنانے کی سعی کریں۔

ثمیں ہندوستان میں ایک بار پھر دُہرایا۔ دوسری ہجری کے اوائل میں جب بنو عباس ایرانی نومسلموں کی مدد سے اُموی حکومت پر غالب آ رہے تھے، اُس وقت امام ابوحنیفہ نے اپنی خداداد فراست سے عراقی[الف] فقہ کو عقلیت کے اعلیٰ اصُولوں پر مدون کیا۔ یہ فقہ اگر اسی حالت میں رہتی، جو امام ابوحنیفہ کی ذہنیت کا نتیجہ تھی تو اعلیٰ عقل مندوں کے سوا دوسروں کے لیے اس تک رسائی مشکل ہو جاتی۔ اور جیسے بہت سے اور ائمہ مذاہب کے فقہی طریقے عام نہ ہو سکے اور آہستہ آہستہ مٹ گئے، یہ فقہ بھی فروغ نہ پاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت نے عجمی ذہنیت کی آسانی کے لیے فقہ حنفی[۲] کی ترویج کے سامان پیدا کر دیئے۔ امام ابو یوسف نے جو امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے عربی نسل کے ذکی الفطرۃ استاد تھے، امام محمدؒ کو اپنا رفیق بنایا۔ ان دونوں نے اپنے استاد کی فقہ کو متوسط طبقے تک پہنچانے کا کام پورا کر دیا[ب]۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک امام ابوحنیفہ کا مذہب فقہی دنیا میں قائم ہے۔

[الف] عراقی فقہ وہ ہے جسے عراق کے عرب ائمہ، صحابہ اور تابعین مرتب کر چکے تھے۔

[ب] اقوام میں کسی تحریک کو محفوظ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ جو چیز متوسط طبقہ میں آ جائے، وُہ فنا نہیں ہوتی۔ ادنیٰ طبقہ اس کی تقلید کر لیتا ہے اور اعلیٰ طبقہ جو کچھ کہتا ہے اسکی عملی صورت یہی ہوتی ہے جو متوسط طبقہ میں ہے۔ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ میں اس کو "رسوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک حقیقت اور حکمت کو جب تک "رسم" نہ بنایا جائے۔ وُہ انسانیت کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔ امام ولی اللہ تمام شرائع الہیہ کے اندر "رسوم" کو مرکز مانتے ہیں۔ قرآن عظیم نے اس کو "معروف" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

ہماری قوم کے ذکی الفطرۃ افراد اعلیٰ علوم فوراً لے لیتے ہیں، مگر ان کو متوسط طبقے تک پہنچانا وُہ ضروری نہیں سمجھتے۔ کیونکہ انہوں نے حکمتِ عملی کا فن کسی استاد سے نہیں سیکھا ہوتا۔ چنانچہ ان کی ساری محنتیں خود ان کی اپنی ذات تک محدود رہتی ہیں، حتیٰ کہ ان کی اولاد بھی ان کے مشرب کی تائید نہیں کرتی۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ حضرت مجدد الف ثانی امام ربانی کے بعد ایک عظیم الشان مجدد ہیں۔ انہوں نے اپنے اتباع میں سے عمل کرنے والے افراد کی ایک جماعت تیار کر دی۔ جس نے شاہ صاحب کے علوم کو عوام تک پہنچانا اپنے لیے ضروری سمجھا۔ ہمارے اہل حدیث بھائیوں کا یہ حال ہے کہ وُہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے دقیق مسائل سے حظ اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ آیا یہ لطیف علوم ہندوستان کا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اللہ تعالیٰ کی غیر متناہی رحمت کا یہ ایک کرشمہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے واقعہ سے ملتا جلتا ایک واقعہ دہلی کی تاریخ میں دہرایا گیا۔ اگر امام عبدالعزیزؒ اپنے والد ماجد امام ولی اللہ کی حکمت، ان کی فقہ و تصوف و فلسفہ اور سیاست کے مخصوص طریقے متوسط طبقے تک نہ پہنچاتے، تو آج امام ولی اللہ کو صحیح طور پر پہچاننے والا مشکل سے دستیاب ہو سکتا اور ہندوستانی مسلمان اس نعمت سے جو تمام انسانیت کے لیے بھی ابر رحمت ہے، ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا۔

امام عبدالعزیز نے سب سے پہلے امام ولی اللہ کے علوم کو عام علمائے زمانہ کے ذہنوں تک پہنچانے کے لیے تصانیف کا سلسلہ شروع کیا۔ امام ولی اللہ کی تفسیر فتح الرحمن کو سمجھانے کے لئے فتح العزیز لکھی فتح العزیز کو ہر ایک عالم بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ مگر یہ لوگ اس کو فتح الرحمن کے غوامض حل کرنے کا ذریعہ نہیں بناتے۔ یہی وجہ

کے لیے تصانیف کا سلسلہ شروع کیا۔ امام ولی اللہ کی تفسیر فتح الرحمن کو سمجھانے کے لیے فتح العزیز کو ہر ایک عالم بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ مگر یہ لوگ اس کو فتح الرحمن کے غوامض حل کرنے کا ذریعہ نہیں بناتے۔ یہی وجہ

ہے کہ امام ولی اللہ نے اپنی کتاب "الفوز الکبیر" میں قرآن سمجھنے کے جو اصول وضع فرمائے تھے، ان کے مطابق قرآن دانی مفقود ہو رہی ہے۔ مثلاً حروفِ مقطعات کی جو تفسیر شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں، اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اور فتح العزیز میں "الم" کی تفسیر پڑھنے کے بعد وہ چیز آسان ہو جاتی ہے۔ نیز فتح العزیز میں عوام کی طبیعت کو جذب کرنے کے لیے ایسی باتیں بکثرت موجود ہیں، جو اُن کے نزدیک مسلّمات میں سے تھیں۔ بے شک ان میں بعض چیزیں حدیث کے فنِ تنقید کی رُو سے غیر ثابت بھی آ جاتی ہیں، لیکن یہاں ان کا مطلب تنقید سکھانا نہیں بلکہ اپنے والد امام ولی اللہ کی حکمت کو عوام تک پہنچانا ہے۔ وہ غیر ثابت حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بنا کر پیش نہیں کرتے، بلکہ اُسے محض اس لیے پیش کرتے ہیں کہ اُن کے مخاطبین کے نزدیک

(بقیہ حاشیہ) متوسط طبقہ بآسانی قبول کر سکتا ہے؟ دراصل ان لطیف علوم کے لیے عربی ذہنیت زیادہ موزوں ہے۔ ہمارے اہل حدیث بھائیوں نے بڑی محنتوں سے چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنا لی ہیں۔ یہ لوگ اس خیال سے اپنی طبیعتوں کو تسلی دے لیتے ہیں کہ زمانہ قیامت قریب آ گیا ہے۔ اس لیے ہماری تحریکیں کامیاب نہیں ہوتیں۔ ان لوگوں کو چاہیئے کہ شاہ ولی اللہ کی حکمت کا مطالعہ کریں۔ اس کے بعد وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی متوسط طاقت کو جو حنفی مذہب رکھتی ہے، پریشان کرنا خود بخود چھوڑ دیں گے۔ یہ امام عبدالعزیز کی طے شدہ مصلحت ہے جس پہ اُن کے اتباع جب تک کام کرتے ہیں کامیاب رہیں گے۔

اس کی حیثیت ایک مسلّم امر کی ہے۔

شیعوں کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور ان کی خلافت پر جو اعتراضات ہوتے تھے، ان کے ردّ میں امام ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب "ازالۃ الخفا" لکھی تھی۔ شاہ عبدالعزیز نے اس کتاب کے مقدمہ کے طور پر کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" تصنیف کی۔ بات یہ تھی کہ شیعوں نے پہلے تو قرآن مجید کی صحیح معرفت اور علم کو امام مہدی کی آمد کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے امام مہدی کی آمد کے متعلق عجیب عجیب توہمات کے پردے ڈال دیئے۔ عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیعیت کی دعوت مسلمانوں کو قرآنِ عظیم کی برکات عامہ سے محروم کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی۔ اِدھر ایرانی حکومت کی مسلسل کوشش سے فرقہ اثنا عشریہ نے امام عبدالعزیز کے زمانے میں شمالی ہند میں اپنا مرکز بنالیا تھا۔ چنانچہ ان کے مسموم پروپیگنڈے سے متوسط طبقوں کے ذہنوں کو بچانے کے لیے شاہ عبدالعزیز نے کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" لکھی۔ علمائے زمانہ "تحفہ اثنا عشریہ" کو تو مزے لے لے کر پڑھتے رہے لیکن انھوں نے اسے امام ولی اللہ کی تصنیف "ازالۃ الخفا" کو سمجھنے کا واسطہ نہ بنایا اور اس طرح اس کتاب کے لکھنے کا جو اصل مقصد تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ یورپ کی قومیں جو پہلے عیسائی تھیں اور آج کل نیچری ہیں۔ قرآنِ عظیم کے انکار کے باوجود اس کے معارف اور اصولوں سے رہنمائی حاصل کر رہی ہیں۔ اس کے برخلاف مسلمان ہیں کہ قرآن پر کامل ایمان رکھتے ہیں، لیکن یہودیوں کی طرح محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے سامنے قرآن کا کوئی واضح پروگرام نہیں رہا اور وہ شیعوں کی طرح کسی بڑے رہنما کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ امام ولی اللہ کی تعلیمات اور اُن کا طریقہ مسلمانوں میں اس مرض کی جڑیں اکھیڑنے کا ضامن ہے۔

امام ولی اللہ نے علوم دینی کی تحصیل کے سلسلہ میں امام مالک کی کتاب مؤطا پر بہت زور دیا ہے چنانچہ وہ اپنے وصیت نامے میں فرماتے ہیں۔

"جب مبتدی طالب علم عربی زبان سمجھنے کے قابل ہو جائے تو مؤطا امام مالک جو یحییٰ بن یحییٰ

کی روایت کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے، مطالعہ کرے۔ اسے چاہیئے کہ اس سے مطلق بے توجہی نہ برتے کیونکہ علم حدیث کی اصل واساس یہی کتاب ہے اور اس کے پڑھنے میں بڑے فائدے ہیں۔ اس کے بعد وُہ قرآن کا مطالعہ کرے اور اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ پہلے ترجمہ وتفسیر کے بغیر صرف قرآن پڑھے۔ اور اگر اس میں کوئی نحو یا شانِ نزول کا مسئلہ مشکل نظر آئے تو وہاں رُک جائے اور اس پر سوچ بچار کرے۔ جب وُہ اسطرح قرآن کے مطالعہ سے فارغ ہو جائے تو پھر تفسیر جلالین پڑھے۔ مطالعہ کا یہ طریقہ بڑا مفید ہے۔"

امام ولی اللہ کے معارف میں مؤطا امام مالک کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ امام ولی اللہ نے اسے اپنے مذاق کے مطابق نئی ترتیب بھی دی اور اس کا نام "المُسوّٰی من المؤطا" رکھا۔ حدیث وفقہ میں امام عبدالعزیز نے اپنے والد حکیم الہند سے یہی کتاب پڑھی تھی۔ آپ نے خاندان کے نوجوانوں کی تربیت میں اسی کتاب کو قرآنِ عظیم کے بعد اساس بنایا اور اس طرح اپنے زمانے کے علماء کو اس طرف متوجہ کیا۔ امام ولی اللہ کی مرتب کردہ "المسوّیٰ" کو پوری توجہ سے پڑھا جائے، تو فقہ حنفی میں محققین[الف] پیدا ہو سکتے ہیں۔ مؤطا کو اس طرح پڑھنے کی برکت تھی کہ ہم نے اپنی سیاحت میں مولانا شیخ الہند اور اُن کے مشائخ سے زیادہ عقلمند فقہا اسلامی ممالک میں نہیں دیکھے۔ ہم نے حرمِ محترم کے علماء کو امام ولی اللہ کی "المسوّیٰ" پڑھائی۔ وُہ اس کی قدر کرنے لگے۔ انہوں نے اس کو اپنے مطبع میں چھاپا اور اسے اپنے مدارس کے نصاب میں داخل کیا۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا شیخ الہند ایک زمانہ ہوا امام ولی اللہ کی کتابوں کو دارالعلوم دیوبند کے درجہ تکمیل میں داخل کرنے کی ہدایت دے چکے ہیں۔ مگر ابھی تک اس پر عمل نہیں ہوا۔ اِنَّمَآ اَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰہِ۔ (میں اپنے رنج وغم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں)۔

[الف] یعنی مجتہد منتسب جیسے ابن ہمام وغیرہ

درس وتدریس کے اس نصاب کے بعد امام ولی اللہ قریش کی زبان اور اُن کی اعتدال پسند معیشت ومعاشرت کو اپنی اولاد میں خاندانی مفاخر کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ”وصیت نامہ“ میں ارشاد ہوتا ہے۔

”ہم یہاں غریب الدیار ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد باہر سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ ہمارے لئے عربی نسب اور عربی زبان باعثِ فخر ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ہمیں سیدالاولین والآخرین، افضل انبیاء ومرسلینؑ فخر موجودات علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰت والتسلیمات سے نزدیک کرتی ہیں۔ اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر یوں ادا کرنا چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے، ان عادات ورسوم کو جو عربِ اوّل کے ساتھ مخصوص تھیں۔ اور یہی دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ومقصود بھی تھا، ہم ہاتھ سے جانے نہ دیں اور رسوم عجم و عادات ہنود کو اپنے اندر نہ آنے دیں“

امام ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں قیصر وکسریٰ کے تعیشات اور تکلفات کی بڑی مذمت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ”مصدی“ یعنی طریقہ کو ان خرابیوں کا برباد کرنے والا بتایا ہے۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ اپنی اولاد کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں کہ قرآن کے انقلاب کو بار دیگر وجود میں لانے کے لئے ضرورت ہے کہ معیشت اور معاشرت میں وُہ اخلاق واوصاف پیدا کئے جائیں۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے تھے۔

امام عبدالعزیز نے اپنے والد کی اس وصیت پر عمل کرتے ہوئے اُس عہد کی سرمایہ داری اور اس کی ترقی یافتہ صورت یعنی شہنشاہی کی لعنتوں کو اس طرح بے نقاب کیا کہ شرفاء کے ایک صالح گروہ کے لیے ان کی خرابیوں کا سمجھنا مشکل نہ رہا۔ پھر امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نوجوان سوسائٹی کو ناز ونعم کی ان رسموں سے پاک کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے جو جہانگیر اور شاہجہان کے عہد اقبال کی یادگار کے طور پر چلی آتی تھیں۔ اب جبکہ سلطنت واقبال کبھی کے رُخصت ہو چکے تھے اور افلاس کا دَور دورہ تھا، یہ رسمیں اعلیٰ خاندانوں کی ہمّت کو گھُن کی طرح کھا رہی تھی[الف]۔ ان نوجوانوں نے اس کام کو

[الف] انسان اگر اپنی معاشی ضرورتوں میں لگا رہے تو اس کا دماغ فراغت سے کوئی اعلیٰ فکر نہیں سوچ سکتا۔ اس (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ ان اصلاح یافتہ خاندانوں کی خواتین کے ایثار سے ہزاروں مجاہدین کا لشکر دس سال تک روٹی کھاتا رہا۔ کسی فرعون اور قارون کے سامنے سر جھکانے پر مجبور نہ ہوا، ورنہ اُس وقت دولت مند طبقوں کا یہ حال تھا کہ اُن کے اندوختہ خزانوں پر اوباش نوجوان اور بد اخلاق عورتیں مسلّط تھیں۔

امام عبدالعزیز کی اس تربیت کی برکت تھی کہ بعد میں سیّد احمد شہید کی قیادت میں ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں کے نازونعمت کے پلے ہوئے نوجوانوں کا لشکر سندھ کے راستہ قندھار و کابل ہوکر پشاور پہنچا۔ اور ان پہاڑوں اور جنگلوں میں مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ان تربیت یافتہ نوجوانوں کا ایک نمونہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی ہیں۔ آپ ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ موصوف فتح علی صاحب کے بیٹے اور رفیع الدین حسین خاں صاحب کے نواسے تھے۔

(بقیہ حاشیہ) سے ہمتیں خود بخود پست ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جب تک خاندان کی زندگی کا بوجھ ہلکا نہ کر دیا جائے اولوالعزم طبائع اپنے سامنے ترقی کا راستہ بند پاتی ہیں ـــــ وہ خاندان کو چھوڑ نہیں سکتے اور خاندان کے بار سے انہیں ایک لمحہ کے لیے فرصت نہیں ملتی

لہ ولی اللہی تحریک کے داعی مسجدوں میں وعظ کرتے، خاندانوں کے پاس کچھ اندوختہ نہ تھا، عورتیں اپنا زیور دے کر ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ اس کے ثبوت میں مدراس کے خان عالم کا واقعہ سوانح احمدیہ میں موجود ہے۔ خود ہمیں اپنا تجربہ ہے۔ کہ دہلی میں ہم نہایت تنگ حالی میں پہنچے۔ مولانا شیخ الہند کے حکم سے کام شروع کر دیا ہمیں ڈھاکہ کے شریف خاندانوں کی خواتین سے روپیہ ملتا رہا، اس کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم کے دو سو روپیہ ماہوار عطیہ سے ہم دہلی میں بیٹھ سکے۔ اس سے پہلے ہم نے جب سندھ میں مولانا شیخ الہند کے ارشاد پر ۱۳۱۰ھ میں کام شروع کیا تو جناب پیر صاحب العلم کے خاندان کی محترم خاتون نے اپنا سنہری ہار (عقد) بھیج دیا۔ نیز ہجرتِ کابل کے موقع پر شیخ عبدالرحیم سندھی کی بیوی، اور ان کی لڑکیوں نے اپنا تمام سنہری زیور بیچ کر ہمارے لیے زادِ راہ مہیا کیا اور کوئٹہ تک ہمیں پہنچا کر نقدی ہمارے حوالے کی۔

جو صوبہ بہار کے ناظم و رئیس تھے۔ آپ نانا کے بڑے لاڈلے تھے۔ ہر وقت ریشمی یا زریں لباس یا ڈھاکہ کی جامدانی اور تن زیب کا جوڑا زیب تن رہتا تھا۔ اور خوشبو و عطر سے معطر رہتے تھے۔ انگلیوں میں سونے کی انگشتریاں اور چھلّے ہوتے۔ لکھنؤ میں تھے تو وہاں کے شوقین، خوش پوشاک، رنگین مزاج نوجوانوں میں آپ کا شمار تھا۔ سید صاحب (سید احمد شہید) کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی حضرت مصعب بن عمیرؓ کی طرح کیفیت بدل گئی۔ اب وہ لکھنؤ اور عظیم آباد کے بانکے نوجوان نہ تھے بلکہ سید صاحب کی جماعت کے ایک جفاکش مزدور اور معمولی خادم تھے۔ رائے بریلی میں مولانا شہید سے حدیث پڑھتے اور آپ کی جماعت کے نائب تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر سر پر اٹھا کر لاتے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے اور مٹی گارے[الف] کا کام کرتے۔

امام عبدالعزیز نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ان تربیت یافتہ افراد کی ایک مرکزی جمعیت بھی بنائی، جس میں سب سے پہلے اپنے تینوں بھائیوں مولانا رفیع الدین، مولانا عبدالقادر اور مولانا عبدالغنی کو رکھا۔ سب سے چھوٹے مولانا عبدالغنی پہلے فوت ہو گئے۔ اس لیے اہلِ دہلی ان سے زیادہ آشنا نہ ہوئے اور "حضرات ثلثہ" کا لفظ اہلِ دہلی کی زبان میں امام عبدالعزیز اور اُن کے دو بھائیوں کے لئے بولا جاتا رہا۔ اس مرکزی جمعیت کی سعی سے نوجوانوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی۔ اس جماعت کے سرکردہ بھی تین چار بزرگ تھے (۱) مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالغنی کے صاحبزادے (۲) مولانا عبدالحی دہلوی، مولانا نور اللہ کے پوتے اور امام عبدالعزیز کے داماد (۳) مولانا محمد اسحاق، امام عبدالعزیز کے نواسے (۴) مولانا محمد یعقوب دہلوی متوفی ۱۲۸۲ھ جو مولانا محمد اسحاق کے بھائی تھے۔ سید احمد شہید اس حزب کے ساتھ منضم کئے گئے۔

خواص کی ان جماعتوں کو تیار کرنے کے ساتھ ساتھ امام عبدالعزیزؒ نے عوام مسلمانوں کو اپنے مقاصد سے آشنا کرنے کیلئے ہفتہ میں دو بار وعظ کہنا شروع کیا اور اس پر آخر تک عمل پیرا رہے۔ ہفتہ میں دو بار منگل اور جمعہ کو دہلی کوچہ چیلاں کے پُرانے مدرسہ میں مجلسِ وعظ منعقد ہوتی تھی جس میں خواص و عوام مور و ملخ کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔ طرزِ بیان ایسا دلکش تھا کہ ہر مذہب کا آدمی،

[الف] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۱۵

مجلسِ وعظ سے خوش ہو کر اٹھتا تھا۔ آپ کی کوئی بات کسی کو گراں نہ گزرتی تھی۔ اس کے ساتھ پابندی کا یہ عالم تھا کہ اشتدادِ مرض کے زمانے میں جب ان کے وعظ کا دن آیا تو آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ "مجھے اٹھا کر بٹھا دو اور دو آدمی مونڈھے پکڑے رہو۔ لیکن جب بیان کرنا شروع کر دوں تو دونوں شخص مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو جائیں"۔ چنانچہ ارشاد کی تعمیل ہوئی اور آپ نہایت اطمینان سے وعظ کہتے رہے، گو لب و لہجہ میں ناتوانی اور کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن استقلال ویسے ہی رنگ جمائے ہوئے تھا۔

امام عبدالعزیز کے ان وعظوں سے عوام میں مستقل بیداری پیدا ہوتی اور خواص ان سے یہ سیکھتے کہ وعظ کے ذریعہ عوام کی کس طرح تربیتِ فکری کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ تربیت یافتہ خواص آپ کی تحریک کے داعی بن کر ہندوستان کے ہر گوشے میں پھیل گئے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک[2] عالم نے سارے ہندوستان کی سیاحت کی اور اسے علم حدیث کا کوئی بھی استاد ایسا نہ ملا جو امام عبدالعزیز کا شاگرد نہ ہو۔

عام وعظ و تبلیغ کے اس سلسلے کے علاوہ امام عبدالعزیز کے ساتھ ساتھ ان کی مرکزی جمعیت کے دونوں طبقوں کے ارکان نے آپ کے طریقہ و منہاج پر خواص اور عوام کی تربیت کے لیے مختلف کتابیں بھی لکھیں۔ خواص کے لیے مولانا رفیع الدین نے اسرار المحبۃ اور تکمیل الاذہان نام کی کتابیں لکھیں۔ اور ان کے علاوہ متعدد رسائل تصنیف کیے۔ یہ دراصل امام ولی اللہ کے فلسفہ ہی کی تشریحیں تھیں۔ نیز "حملۃ العرش" کی تحقیق میں ان کا ایک رسالہ نہایت بلند اور اعلیٰ فکر پیش کرتا ہے۔ امام عبدالعزیز نے وہ رسالہ اپنی تفسیر میں نقل کر دیا ہے۔ ایسا ہی سورۂ نور کی تفسیر میں مولانا رفیع الدین کا رسالہ بے نظیر ہے۔

خواص کو حکیم الہند امام ولی اللہ کے فلسفہ کی باریکیوں سے متعارف کرانے کے لیے مولانا اسمٰعیل شہید نے "عبقات" لکھی۔ اس میں آپ نے شیخ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ اور امام ربانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ کی تحقیقات پر بحث کرتے ہوئے امام ولی اللہ کی حکمت کامل سے مقابلہ کیا اور ان پر حکیم الہند کی حکمت کا تفوق ثابت کیا ہے۔ عوام کے لیے مولانا رفیع الدین نے قرآن عظیم

---

[1] مسلمانوں کا شاندار ماضی، ص ۳۲۱ [2] یہ عالم غیر ہندوستانی تھے۔ نام یاد نہیں ہے۔ (مولانا نور الحق علوی)

کا لفظی ترجمہ ہندی[1] میں کیا۔ اس کی مدد سے دہلی کے عوام امام عبدالعزیز کے وعظ سے پوری طرح مستفید ہوتے رہے۔ نیز مولانا عبدالقادرؒ[2] نے قرآن عظیم کا با محاورہ ترجمہ کیا۔ "موضح القرآن" کے ذیل میں آپ کے تشریحی ارشادات آج تک علمائے محققین کے لیے بصیرت افروز ہیں۔ مولانا عبدالحی نے لغات القرآن[3] لکھی اور مولانا اسمٰعیل شہید نے اپنی عربی کتاب "ردالاشراک" کا ترجمہ "تقویۃ الایمان" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب اگر پانچ سو[4] برس پہلے لکھی جاتی تو ہندوستانی مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتا۔ اس کے علاوہ مولانا محمد اسحاق نے حدیث کی کتاب "مشکوٰۃ" کا بھی ہندی میں ترجمہ کیا۔

---

[1] واضح رہے کہ اس زمانے میں اردو کو گویا ہندی ہی کہا جاتا تھا۔

[2] شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کے متعلق "واقعاتِ دہلی" صفحہ ۵۸۸ میں مذکور ہے کہ یہ ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں ہوا۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کا ایک ایڈیشن بمطبع مفید عام آگرہ نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیٔ بھوپال کے حکم سے چھپا تھا۔ اس میں شاہ عبدالقادر کا دیباچہ بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں: "اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی فارسی ترجمہ کر گئے ہیں۔ سہل و آسان اب ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کرے۔ الحمد للہ کہ ۱۲۰۵ھ میں میسر ہوا" کچھ عرصہ بعد آپ نے بعض فوائد "موضح القرآن" کے تاریخی نام سے لکھے۔ اس عبارت سے خیال گزرتا ہے کہ شاہ عبدالقادر اپنے بھائی کے اُردو ترجمہ سے مطلع نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شاہ رفیع نے اسی سال یا اس کے بعد ترجمہ لکھا۔ بعض پرانے ثقات سے سُنی ہوئی بات ہے کہ شاہ رفیع الدین نے صرف چند سورتوں کا ترجمہ کیا۔ اور مولانا عبدالحی نے اسے پورا کیا ــــ دونوں ترجموں پر مولوی نذیر احمد نے اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں جو کچھ لکھا ہے، وہ وہاں ملاحظہ ہو۔

[3] "لغات القرآن" فارسی زبان میں ہے اور طبع ہو چکی ہے۔ ہمیں طالب العلمی کے زمانے میں دیوبند میں مفت تقسیم ہو کر ملی تھی۔ مکررات کو حذف کر کے وہ علی الترتیب مشکل الفاظ کا ترجمہ فارسی میں دیتے جاتے ہیں۔ مثلاً لاریب فیہ" میں "ریب" کا ترجمہ "متقین" کے معنی وعلیٰ ہذا القیاس اس طرز سے لغت یاد ہو کر قرآن عظیم کا سمجھنا سہل ہو جاتا ہے۔

[4] یعنی اس میں شرکیہ رسوم کا اثر نہ آنے پاتا۔ حنیفی طریقہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام عبدالعزیز کی تعلیم وارشاد کا اثر ہندوستان سے باہر حجاز کے ذریعہ استنبول تک پہنچا۔ غالباً شیخ خالد کردی ؒ اس میں واسطہ بنے، شیخ موصوف نے مولانا غلام علی کی خدمت میں سلوک کی تکمیل کی تھی اور مولانا اسمٰعیل شہید کی صحبت کے توسط سے امام عبدالعزیز سے مستفید ہوئے تھے۔ شیخ خالد کردی کا ایک مشہور قصیدہ ہے، جس میں موصوف نے بیان کیا ہے کہ میں علمائے خراسان کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ میں نے دہلی میں مولانا غلام علی کی خدمت میں جانے کا ارادہ کیا تو وہ لوگ مانع ہوئے۔ مگر میں ان کے اثر میں نہ آیا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر ہے۔

بدہلی ظلمت کفر است گفتند وبدل گفتم
بظلمت رو اگر در جستجوئے آب حیوانی

(بقیہ حاشیہ) ہندوستان کی پرانی سیکالوجی سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔ اگر یہ تعلیم ایک ہندوستانی سلیم الفطرۃ کو ملتی تو وہ دوسری قوموں سے اسلامیت میں بہت بڑھ جاتا۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ بغداد سے جب علوم خراسان گئے تو وہ لوگ تشبیہ اور تجسیم کے جھگڑوں میں اس قدر پریشان ہوئے کہ اسلام کی صحیح تعلیم میں پیچھے رہ گئے۔ ہندوستانی تجلّی الٰہی کے مسئلے کو بہت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اور حنیفی طریقہ بھی اس تجلّی الٰہی کے ذریعہ سارے علوم واسرار معرفت الٰہی سکھاتا ہے۔ تجلّی کے مسئلے کو خراسانیوں نے نہیں سمجھا۔ اس لیے مسلمانوں کو انہوں نے اس وجہ سے بہت پیچھے ڈال دیا اور قرآن ان کی ذہنیت پر منطبق ہی نہیں ہوتا، جب تک وہ اس کی کوئی تاویل نہ کرلیں۔ صوفیۂ کرام نے اس مصیبت کو کم کرنے کی یقیناً کوشش کی، مگر وہ صاحبِ بیان نہ تھے کہ علماء ان سے استفادہ کرتے۔ بے شک وہ صاحبِ حال ہیں، جو ان کی صحبت میں پہنچا رنگا گیا۔

"کتاب التمہید" میں شاہ اسمٰعیل شہید کے متعلق مولانا سندھی فرماتے ہیں "اسلام کے اظہار سے پہلے میں نے شاہ صاحب کی تقویۃ الایمان پڑھی تھی۔ چنانچہ ردّ شرک کے متعلق مجھے اس سے بڑا فائدہ پہنچا، بلکہ ایک لحاظ سے یہ کتاب مجھے اسلام میں لانے کا ذریعہ بنی —— غرضیکہ امام محمد اسمٰعیل میرے استاد اور امام ہیں اور مجھے ان سے بہت محبت ہے، ایسی محبت جس طرح لوگ اپنے مذاہب کے ائمہ سے کرتے ہیں"

خالد کردی کے شیخِ طریقت مولانا غلام علی بھی امام عبدالعزیز کے اصحاب میں سے تھے۔

استنبول کے علماء کی طرف سے امام عبدالعزیز کی خدمت میں یہ دعوت[1] نامہ آیا کہ آپ آستانہ تشریف لائیں تو یہاں کی تمام علمی جماعتیں آپ کی سیادت میں کام کریں گی، لیکن امام عبدالعزیز نے اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ کے ہندوستانی کام کی تکمیل سے علیحدہ ہونا پسند نہ کیا۔

حکیم الہند امام ولی اللہ نے اپنی دعوتِ فکر اور نظام اجتماع کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو جماعت بنائی تھی، اس کی اپنی امتیازی خصوصیات تھیں ــــ چنانچہ جن لوگوں نے امام ولی اللہ امام عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کی کتابیں نہیں پڑھیں، وُہ حزب ولی اللہ کی ان امتیازی خصوصیات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اس حزب کے مقاصد کے بارے میں بہت کم عربی زبان میں لکھا گیا ہے۔ البتہ عربی سے زیادہ فارسی[2] زبان میں۔ اور پھر خالص ہندی یعنی اردو میں حزب ولی اللہ پہ کتابیں تحریر ہوئیں۔ عربی چونکہ دنیائے اسلام کی مشترک زبان تھی اور اس میں حزب ولی اللہ کے متعلق بہت کم لکھا گیا تھا، اس لئے عربی اور ترکی ممالک ولی اللہی تحریک سے زیادہ روشناس نہ ہو سکے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ضرور پیش نظر رہنی چاہیئے کہ امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیز کے زمانے میں بیرونِ ہند جس قدر اسلامی تحریکیں پیدا ہوئیں، جیسے ایران میں بابی، نجد میں وہابی اور یمن میں زیدی۔ ان سب کے اپنے اپنے خاص پروگرام تھے، اور حزب ولی اللہ کی ہندوستانی تحریک نہ تو ان میں سے کسی مقصد میں اشتراک رکھتی ہے، اور نہ کسی تحریک سے اس کا طریقِ عمل مشابہ ہے۔ ظاہر ہے حزب ولی اللہ کی ایران کی بابی تحریک کے ساتھ مشابہت تو کسی کے وہم وگمان میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ بابی تحریک ایرانی شیعیوں کی تحریک تھی۔ اور ان کے برعکس ولی اللہی تحریک کے اساسی اصولوں میں سے

---

[1] یہ روایت زبانی ہے اور مشائخِ دیوبند میں سلسلہ بہ سلسلہ چلی آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا رحمت اللہ مہاجر کی کا استنبول سے تعلق تھا اور دعوت میں ایسے الفاظ تھے کہ ہم آپ کی کفش برداری کو فخر سمجھتے ہیں۔ مولوی محمد حسین بٹالوی کی "اشاعۃ السنۃ" میں غالباً اس کے متعلق کچھ مواد مل سکے۔

[2] ہندی فارسی میں، نہ کہ ایرانی فارسی میں۔

ایک یہ تھا کہ عوام و خواص کو فرقۂ شیعہ کی غلطیوں سے بچایا جائے۔ البتہ عرب کی نجدی تحریک سے ولی اللٰہی تحریک بعض امور میں اشتراک رکھتی ہے، اس لیے ظاہر بیں دونوں کو یکساں سمجھ لیتے ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ کے ماننے والوں میں سے سرزمین نجد میں ۱۱۱۵ھ میں محمد بن عبدالوہاب ۲۵ پیدا ہوئے۔ انہوں نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ حزب ولی اللہ میں بھی توحید کی دعوت اسی طرح موجود ہے۔ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا احترام بھی دونوں تحریکوں میں مسلّم ہے۔

امام ولی اللہ جب حجاز تشریف لے گئے تو انہوں نے شیخ ابراہیم کُردی مدنی کے کتب خانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصنیفات سے بے شک کافی استفادہ کیا تھا۔ امام ولی اللہ کی کتاب ازالۃ الخفا[1] میں بعض اساسی مسائل ایسے مذکور ہیں جو یقیناً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصنیف منہاج السنۃ سے لیے گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ حجاز کے قیام کے دوران میں شاہ ولی اللہ نے سب سے زیادہ فائدہ شیخ ابو طاہر سے اٹھایا تھا۔ شیخ موصوف کے والد شیخ ابراہیم کُردی کے متعلق ابجد العلوم صفحہ ۸۴۶ میں لکھا ہے۔

"موصوف علوم فقہ و حدیث اور عربی میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ آپ نے اس سلسلے میں کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ موصوف نے بغداد، شام، مصر اور مکہ مدینہ کی سیاحت کی۔ القشاشی کی صحبت میں بیٹھے اور ان سے حدیث کی روایت کی۔ شیخ فارسی، کردی، ترکی اور عربی یکساں بولتے تھے۔ آپ کی مجلس رونق و تازگی

---

[1] فتنۂ عثمان سے پہلے جو زمانہ گزرا اس کے متعلق شاہ ولی اللہ کا یہ نظریہ ہے کہ صحابہ میں اختلاف ہوا ہی نہیں البتہ جس قدر اختلاف مروی ہے وہ مشورہ کرنے میں جیسے اختلاف ہوتے ہیں، اس نمونہ کا ہے۔ مگر یہ کہ صحابہ کے فیصلہ میں اختلاف ہوتا، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ جب مشورے کے لیے بیٹھتے تو ایک نہ ایک فیصلہ پر متفق ہو کر اُٹھتے۔ اس پر شاہ صاحب نے ازالۃ الخفا میں بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ یہ ان کی بہت بڑی علمی اساسی چیز ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ منہاج میں اس کو ایک آدھ سطر میں لکھ جاتے ہیں، مگر بہر حال اس امر کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ ہم شاہ ولی اللہ کی اس لیے عزت نہیں کرتے کہ وہ تمام چیزیں از خود ایجاد کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شاہ صاحب سلیم الفطرت ہیں اور ائمہ متقدمین کی صحیح باتیں اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ انکی عظمت کا راز ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ شیخ اکبر اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ دونوں کی اچھی تحقیقات یکساں طریقہ پر قبول کرتے ہیں۔

میں خلد بریں کا ایک نمونہ تھی۔ موصوف حکمت فلسفہ کے حقائق پر صوفیہ کے ارشادات کو ترجیح دیا کرتے اور فرماتے کہ یہ فلسفی حقیقت کے قرب وجوار تک تو پہنچ جاتے ہیں، لیکن حقیقت کا ادراک ان کے بس میں نہیں۔ آپ کی وفات کی تاریخ اِنّا عَلیٰ فِرَاقِکَ یَا اِبْرَاھِیْم لَمَحْزُوْنُوْن۔ (ہم آپ کی مفارقت پر غم زدہ ہیں) ہے۔" امام ولی اللہ اپنے استاد شیخ ابو طاہر کے توسط سے انہی شیخ ابراہیم کی اتباع میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی یکساں عزت کرتے ہیں اور دونوں کی عظمت کے معترف ہیں، لیکن وہ اس میں امام ربانی شیخ احمد سرہندی کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک امام ربانی کے بعض بیانات کے اغلاق سے ان کے مطالب کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ ولی اللہی تحریک عرب کی نجدی تحریک سے بعض امور میں مشابہ تھی۔ اس کی ایک مثال اسمٰعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان ہے۔ یہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے ماخوذ ہے لیکن بعض مقامات پر اس میں شیخ عبدالوہاب کی کتاب "التوحید" کی طرح ایک سی بات لکھی ہے۔ یہ اسباب ہیں جن کی بناء پر ہندوستان کے وہ اہلِ علم جو حزب ولی اللہ کے مخالف تھے، ان مشترک مباحث کی وجہ سے دونوں تحریکوں کو ایک ثابت کرنے کے لیے کافی سے زیادہ کوشاں رہے۔ لیکن اگر ولی اللہی تحریک کے اساس و مبادی پر اچھی طرح سے غور کیا جائے تو دونوں تحریکوں کی کُھلی مشابہت کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتی۔ امام ولی اللہ کی عقلیت اور ان کا فلسفہ مسئلۂ وحدۃ الوجود پر مترکز ہے۔ اور تو اور وہ امام ربانی کے وحدۃ شہود کے عقیدہ کو بھی وحدت الوجود کے ساتھ مطابقت دیتے ہیں۔ دوسری طرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہیں، جو وحدت الوجود کے ماننے والوں سے اس قدر شدید نفرت رکھتے ہیں کہ دنیا جانتی ہے۔ ظاہر ہے جب دونوں تحریکوں کے اساس و مبادی میں اس قدر اختلاف ہے تو ان کو محض بعض امور میں مشابہ ہونے کی وجہ سے ایک نہیں کہا جا سکتا۔

تحریک ولی اللہی اور نجدی تحریک میں عدم مشابہت کی ایک اور مثال سنیئے۔ مولانا اسمٰعیل شہید "تقویۃ الایمان" میں "التوسل فی الدعا" کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور "شرکِ اصغر" کے مرتکب کو کافر نہیں مانتے

گو اسے غیر مغفور سمجھتے ہیں "تقویۃ الایمان" کے یہ دو اہم مسئلے ہیں جو "کتاب التوحید" کے منافق ہیں اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیرو ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتے، جو ان دو مسئلوں میں مولانا محمد اسمٰعیل شہید کے تابع ہوں۔ ایسی حالت میں دونوں تحریکوں کو ایک جاننا سطحی نظر اور سرسری طور پر سمجھنے کا نتیجہ ہے۔[26]

عرب کی ایک دوسری تحریک کے، جو یمن سے تعلق رکھتی ہے، ایک بزرگ امام شوکانیؒ[27] ہیں جو بڑے محقق اور محدّث تھے۔ حزب ولی اللہؒ کے پیروؤں میں سے بعض فرقے مستقل طور پر امام شوکانی کی متابعت کا دم بھرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اِتباعِ سنت کی تفصیلی دعوت میں امام شوکانی بھی حزب ولی اللہؒ کے شریکِ کار ہیں۔ لیکن حقیقت شناس جانتے ہیں۔ کہ شوکانی زیدی ہیں اور گو حنفیہ سے بعض مسائل میں وہ متفق ہیں، پھر بھی وہ "حجۃ اجماع"[1] پر صاف رائے نہیں رکھتے۔ قاضی شوکانی کی کتاب "ارشاد الفحول" اور مولانا اسمٰعیل شہید کا رسالہ "اصولِ فقہ" ملا کر پڑھئے تو فرق واضح ہو جائے گا۔

اس وضاحت کے بعد ولی اللّٰہی تحریک کا سلسلہ عرب کی نجدی اور یمنی تحریک سے ملانا اور ان سب کو ایک ہی زمرہ میں داخل کرنا کسی طرح بھی قرینِ صواب نہیں ہو سکتا۔ دراصل اگر کوئی بزرگ امام ولی اللہ کی تحریک کے لیے سلفِ صالح کا مرتبہ رکھتے ہیں تو وہ فقط امام ربّانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ہیں۔ ان کو امام ولی اللہ اپنے طریقہ کا ارہاص[2] مانتے ہیں۔ امام ربانی نے جو کام شروع کیا تھا۔ امام

---

[1] حجۃ اجماع پر مدار ہے صدیق اکبرؓ کی خلافت کا اور مصحفِ عثمانؓ کے مسلّم اور متبوع ہونے کا۔ اس زمانے میں ہم اجماع کے بجائے مرکزی جمعیت کا فیصلہ کہہ لیتے ہیں۔ آج جس چیز کو مرکزی جمعیت کا فیصلہ کہا جاتا ہے، وہی اس زمانے میں اجماع سے مقصود تھا۔ اجماع یا مرکزی جمعیت کے فیصلہ کو قانونی طور پر حجت سمجھے بغیر کوئی سیاسی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ شیعہ اجماع کی اس قانونی حجت کو نہیں مانتے، مگر اہل سنت کا مدار ہی سراسر اسی پر ہے۔ ظاہر ہے اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو دونوں مسلکوں کا فرق صاف نمایاں ہو جاتا ہے۔

[2] ارہاص سے مراد یہاں راہ صاف کرنے والا ہے۔ مثلاً ہمیں عمارت بنانا ہے تو زمین میں جس قدر نشیب و فراز ہیں، ان کو ہموار کرنا ارہاص کا درجہ رکھتا ہے۔

ولی اللہ نے اس کو مکمل کر دیا۔

الغرض جب امام عبدالعزیز اور ان کی مرکزی جمعیت کے ارکان کی تعلیمی، تبلیغی، فکری اور عملی جدوجہد سے ولی اللہی تحریک کے مبادی کا تعارف ملت سے اچھی طرح سے ہو گیا تو اُس وقت امام عبدالعزیز ایک ایسے نوجوان کی راہ دیکھ رہے تھے، جو عسکری معاملات سے دلچسپی رکھتا ہو، تاکہ اُس کے ذریعہ اپنی انقلابی تحریک کے دوسرے حصے کی تکمیل کرائیں۔ اللہ کی رحمت سے رائے بریلی کے سید شاہ علم اللہ کے خاندان کا ایک نوجوان سید احمد امام عبدالعزیز کی دعوت میں شرکت کے لیے آیا۔ موصوف انہیں اس مطلب کے لیے زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی تربیت کی طرف خاص توجہ کی جانے لگی۔

سید شاہ علم اللہ عالمگیری عہد کے مشہور عالم ربانی اور صاحب سلسلہ شیخ تھے۔ ان کے فرزند سید محمد ضیاء اور ان کے بیٹے شاہ ابو سعید ہیں۔ آپ سید احمد شہید کے جدِ مادری اور امام ولی اللہ کے خلیفہ تھے۔ شاہ علم اللہ کا دائرہ رائے بریلی میں تھا اور ولی اللہی تحریک کے ابتدائی مرکزوں کے سلسلے میں اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ سید احمد شہید صفر ۱۲۰۱ھ میں اسی دائرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید محمد عرفان تھا۔ سید احمد شہید نے عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا محمد اسحاق اور مولانا اسمٰعیل شہید سے پڑھیں۔ قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث مولانا عبدالقادر کے درس میں سنتے رہے۔ اور انہیں کی صحبت میں سلوک کی تکمیل کی۔ سید احمد شہید کے متعلق (سر) سید احمد دہلوی اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں۔

"سید احمد بریلوی اوائلِ حال میں شوقِ طالب علمی میں واردِ شاہجہان آباد ہو کر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے اور صرف و نحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ اکثر خدمت مسجد اور اس مقام کے واردوں، خصوصاً درویشانِ پاک طینت کی جو تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب مولانا عبدالقادر کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، خاطرداری اور سرانجام مہام میں ایسے سرگرم ہوئے گویا اس امر کو اہم مہام سمجھے ہوئے تھے۔"

جب ذکر اللہ سید احمد شہید کی طبیعت میں راسخ ہو گیا تو ان کی عالی دماغی اور اولوالعزمی سے ایسے

کلمات صادر ہوئے جو ایک ایسے مصلح کی زبان سے نکلتے ہیں جو تمام انسانیت کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہو۔ امام عبدالعزیز نے یہ کلمات سُنے تو فرمایا۔ تِلْکَ خَیَالَاتٌ تُرَبّٰی بِھَا اَطْفَالُ الطَّرِیْقَۃِ۔ یعنی[۱] اس طرح ان کے فطری جوہر کی تربیت ہو رہی ہے۔ سنہ[۲۹] ۱۲۲۵ھ یا سنہ ۱۸۱۱ء میں امام عبدالعزیز نے سیّد احمد شہید کو فوجی تربیت کے لیے امیر خاں والی ٹونک کے لشکر میں بھیجا۔ موصوف نواب مرحوم کے لشکر میں چھ سال سے زائد رہے۔ سنہ ۱۲۳۱ھ یعنی سنہ ۱۸۱۶ء میں جب نواب امیر خاں نے انگریزوں سے صلح کر لی تو سیّد احمد شہید واپس امام[۲] عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچ گئے۔

امام عبدالعزیز کے خواص اصحاب جن کے رگ و ریشہ میں حزب ولی اللہ کی خصوصیات سرایت کر چکی تھیں اور ایک لمبے زمانے سے ان کی تربیت ہو رہی تھی، یہ وہ لوگ تھے جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ سیّد احمد شہید دراصل اس حزب میں سے نہ تھے بلکہ بعد میں ان کے ساتھ منضم[۳] کیے گئے۔ موصوف میں کشفی کمالات تھے۔ سپہ گری کی تعلیم تھی۔ اور پھر آپ سیّد تھے۔ اس لیے امام عبدالعزیز

---

[۱] جب کوئی پہلوان شاگردوں کو کشتی سکھاتا ہے۔ تو یوں کرتا ہے کہ خود ان کے آگے گر جاتا ہے۔ شاگرد سمجھتا ہے کہ میں نے استاد کو گرا لیا۔ اس سے اصل میں اس کی تربیت مقصود ہوتی ہے۔ یہی مثال سیّد احمد شہید کی تھی۔ انکی زبان سے بلند باتیں سرزد ہوتی ہیں کہ میں یوں کروں گا۔ اسطرح کر دکھاؤں گا۔ اس سے ان میں عالی حوصلگی پیدا ہو رہی تھی۔ سیّد صاحب کا ایک جملہ "سوانح" میں منقول ہے کہ "انہوں نے اپنے اہلِ بیت میں سے کسی آدمی سے کہا کہ اگر تمہیں کوئی کہے کہ سیّد احمد فوت ہو گیا ہے تو جب تک تم یہ نہ دیکھو کہ ہندوستان سے کفر نکل گیا ہے۔ افغانوں سے فلاں فلاں عیب جاتے رہے۔ عربوں سے فلاں فلاں خرابی دُور ہو گئی۔ ترکوں کی فلاں کمزوری رفع ہو گئی ہے۔ جب تک یہ ساری باتیں پوری نہ ہولیں کبھی یقین نہ کرنا کہ سید احمد فوت ہو گئے۔" یہ ہے تِلْکَ خَیَالَاتٌ تُرَبّٰی بِھَا اَطْفَالُ الطَّرِیْقَۃِ یعنی عالی حوصلگی۔

[۲] سیّد صاحب نے امام عبدالعزیز کو لکھا۔ "خاکسار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے۔ اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔" سیرت صفحہ ۷۱

[۳] یہی وجہ ہے کہ مولانا سندھی نے امیر شہید کا (مستقل عنوان سے) تذکرہ نہیں کیا۔ محمد نور الحق۔

نے ان کو امارت جہاد کے لیے موزوں سمجھا۔ لیکن ان کے ساتھ اپنے مکمل تربیت یافتہ افراد میں سے دو وزیر مقرر کر دیئے۔ حقیقت میں جہاد کی قیادت اس منتخب بورڈ کے ہاتھ میں تھی۔ گو امارت سید احمد شہید کے سپرد کی گئی تھی، اس تقسیم کار کو سمجھنے کے لیے امام ولی اللہ کی کتاب "بدور بازغہ" سے بڑی مدد لی سکتی ہے۔ حکیم الہند نے اجتماع انسانی کی مدنی ضروریات کو پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ قضاء، شہر یاریت، جہاد، نقابت، انداز و تبشیر۔ ان میں سے ہر ایک کی تکمیل کے لیے ایک ایسے کامل کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس کام کو چلانے کی خصوصی مہارت رکھتا ہو۔ ان پانچ رہنماؤں کے ساتھ ایک ایسا امیر بھی چاہیئے جس کو ان تمام کاموں میں مہارت کاملہ حاصل ہو۔ وہی حقیقی طور پر امام بننے کا مستحق ہے۔ فَالرَّجُل الوَاحِد المتكفّل بِهَا جَمِيعًا هُوَ الامام الحق۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر تو یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان میں سے دو یا تین کاموں کو ایک آدمی اپنے ذمہ لے لیتا ہے اور باقی کاموں کو دوسرا آدمی۔ مدینہ ناقصہ[1] میں تو ہر کام کا ایک نہ ایک رواج بن جاتا ہے۔ جو شخص اس کام کا کرتا دھرتا ہوتا ہے وہ اسی رواج کے مطابق اپنی رائے دیتا ہے۔ اور کام چلانے کی تیسری صورت یہ ہے کہ قوم کے ممتاز اور عقلمند لوگ باہم مل بیٹھتے ہیں۔

آج کل کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حقیقی امام کا جو ڈکٹیٹر بن سکے، پیدا ہونا آسان نہیں۔ اس کے نہ ملنے پر حکومت کی تشکیل ان تین صورتوں میں سے کسی ایک پر ہو سکتی ہے (۱) چند افراد کا ایک بورڈ بنا دیا جائے۔ (۲) اگر محدود سوسائٹی ہو تو اس کا ہر ایک حصّہ اپنے مسلّمہ رواج کو ماننے اور اپنے رئیس کی اطاعت میں قومی قانون کی پابندی کرے یعنی سوسائٹی کو حکومت بنانے کی ضرورت ہی نہ ہو گی۔ ان میں اس قسم کے اختلاف پیدا ہی نہیں ہوتے، جن کی وجہ سے وہ امام بنانے پر مجبور ہوں۔ (۳) عقلمندوں یا عوام کے مقبول لوگوں کا اجتماع ہو، یعنی پارلیمنٹ بنے۔

---

[1] مدینہ نامہ سے مراد وہ اجتماع ہے۔ جس میں باقاعدہ حکومت ہو۔ اور مدینہ ناقصہ جہاں منظم حکومت نہ ہو۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے سوسائٹی کہتے ہیں۔ انارکسٹ حکومت کو نہیں مانتے۔ انکے نزدیک سوسائٹی پر انسانی ترقی رک جاتی ہے۔

دراصل بات یہ تھی کہ امام عبدالعزیز کے آخری عہد میں ہندوستان کی اسلامی سیاست میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے بعد کام کرنے کے لیے اپنے لوگوں میں سے کسی میں امامت کی صلاحیت نہ دیکھی کہ اس کو ڈکٹیٹر بناتے۔ اس لیے دو بورڈ بنا دیے گئے۔ عسکری امور کے لیے سید احمد شہید امیر اور مولانا عبدالحی اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید مشیر مقرر ہوئے۔ امام عبدالعزیز نے اپنی تمام جماعت کو حکم دیا کہ جس معاملے میں سید احمد شہید، مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل شہید تینوں جمع ہو جائیں، اس کو امام عبدالعزیز کا حکم[1] سمجھنا چاہیے۔ تنظیمی اُمور کے لیے آپ نے مولانا محمد اسحاق کو امیر اور مولانا محمد یعقوب (برادر مولانا محمد اسحاق) کو ان کا مشیر مقرر کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے مولانا محمد اسحاق کو ہر معاملے میں اپنے ساتھ شریک[2] رکھ کر لوگوں کو سمجھا دیا کہ ان کا حکم میرا حکم ہے۔ غرضیکہ امام عبدالعزیز کا یہ فیصلہ امام ولی اللہ کے بتائے ہوئے اصولِ اجتماع کے بالکل مطابق تھا۔

یہ طریقہ کار تھا جس پر چل کر امام عبدالعزیز نے اس طویل عرصہ میں تدریج حزب ولی اللہ کی تنظیم کی۔ چنانچہ جب یہ تمہیدی مراحل طے ہو گئے تو آپ نے سنہ ۱۲۳۱ھ میں پہلی دفعہ سید احمد شہید اور ان کے بورڈ کے ارکان مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل کو اطرافِ ملک میں بیعت طریقت لینے کی غرض سے بھیجا۔ سنہ ۱۲۳۶ھ میں دوسری دفعہ یہ بورڈ جہاد کی بیعت لینے کے لیے دورہ پر نکلا۔ اس کے بعد ان کو سارے قافلہ سمیت حج پر جانے کا حکم مِلا تاکہ انہیں اپنی قوت کی مزید تنظیم کا تجربہ حاصل ہو سکے۔

سید احمد شہید اور ان کے رفقائے کار کے ان دوروں کی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے

---

[1] بعد میں یہ غلطی ہوئی کہ شاہ عبدالعزیز کے فیصلہ یعنی بورڈ کی حکمت کو نہ سمجھ کر سید صاحب کو امیر مطلق یعنی امام کے درجہ پر مان لیا گیا۔ یہ ان لوگوں کی مداخلت سے ہوا جو امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نہ تھے۔ آخرکار جو شکست ہوئی اُس میں اس اصولی تبدیلی کا بڑا دخل ہے

[2] شاہ عبدالعزیز کے اس خصوصی سلوک کا نتیجہ تھا کہ لوگوں کو شاہ محمد اسحاق کی امامت قبول کرنے میں کوئی عذر پیدا نہ ہوا۔ گو "سوانحِ احمدیہ" کا مصنف شاہ اسحاق کی حیثیت کم کرنا چاہتا ہے۔ مگر دنیائے اسلام میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ملتا جو اپنا سلسلۂ اسناد شاہ عبدالعزیز تک پہنچائے اور شاہِ اسحاق بیچ میں واسطہ نہ ہوں۔

ولی اللہی تحریک کے ایک اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ امام ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسلام کی مستقل حکومت کا آغاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے ہی ہو چکا تھا۔ اور آپؐ کے دعاۃ، یعنی دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے اس مستقل حکومت کے امیر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کے نمونہ پر حزب ولی اللہ کی تنظیم میں بھی دعاۃ کے سلسلے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ امام عبد العزیز نے امیر شہید، مولانا عبد الحی اور مولانا محمد اسمٰعیل کو دراصل اسی سلسلۂ دعاۃ کا نظام قائم کرنے کے لئے اطراف ملک میں روانہ کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ گویا ابتداء تھی اس امر کی کہ حزب ولی اللہ اپنی سیاسی پارٹی کی تشکیل و تنظیم کر کے اب امارت اور حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتی ہے، یعنی یہ لوگ اب اپنی حکومت بنائیں گے اور جہاد کریں گے۔

سنہ ۱۲۳۹ھ میں یہ قافلہ جب حج سے واپس آیا تو امام عبد العزیز فوت ہو چکے تھے۔ اور انہوں نے اپنے آخری وقت میں مولانا محمد اسحاق کو مدرسہ سپرد کر کے اپنا قائم مقام بنا دیا تھا۔

الصدر الحمید امام محمد اسحاق

۱۲۳۹ھ تا ۱۲۶۲ھ

۱۲۳۹ھ میں امام عبدالعزیز فوت ہوئے تو آپ نے اپنا مدرسہ مولانا محمد اسحاق کے سپرد کیا۔ یہ حزب ولی اللہ کی امامت کا عُرفی دستور تھا۔ سیّد احمد شہید کا قافلہ جب حج سے واپس آیا تو انہوں نے امام عبدالعزیز کے بعد شاہ محمد اسحاق کی امامت کو تسلیم کر لیا۔ اس زمانے میں اگر جمعیت کا اجلاس مدرسہ میں ہوتا تو مولانا محمد اسحاق صدارت کرتے اور سیّد احمد شہید حلقے میں بیٹھتے۔ جب مدرسہ سے باہر مجلس منعقد ہوتی تو سیّد احمد شہید صدر بنتے اور مولانا محمد اسحاق حلقہ میں شریک[1] ہوتے۔ یہی طرح حزب ولی اللہ کی سیاسی مصلحت کی حفاظت اور رجال اور اموال جمع کرنے کے لیے دُعاۃ کا سلسلہ امام عبدالعزیز کے مدرسہ سے متعلق رہا اور عسکری اور سیاسی قیادت سید احمد شہید کی جماعت سے وابستہ ہوئی۔

---

[1] اس روایت کی اصل "امیر الروایات" کا بیان ہے۔ "امیر الروایات" اور "ارواحِ ثلاثہ" کی تصنیف کا تعلق امیر شاہ خاں صاحب سے ہے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے خاص خادم ہیں۔ یہ کتابیں انکی بیان فرمودہ حکایات کا مجموعہ ہیں۔ خاں صاحب کا کمال یہ تھا کہ جملہ واقعات ان کو سند اور حوالے سے لفظ بلفظ یاد تھے۔ خورجہ کے متوطن اور (باقی اگلے صفحہ پر)

سید احمد شہید معہ اپنے ہمراہیوں کے ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو دو سال گیارہ ماہ بعد سفر حج سے واپس آ گئے تھے۔ اسی سال ذی الحجہ ۱۲۳۹ھ میں جہاد کی تیاری شروع کر دی گئی۔ مولانا محمد اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی نے ترغیب جہاد کے لیے اطراف ہند کا دورہ کیا۔ جب تقریباً دو ہزار مجاہدین کا اجتماع ہو گیا تو امیر شہید نے ان کے تین حصے کر دیئے اور انہیں کوچ کا حکم دیا۔ خود کچھ عرصہ ٹونک رہ کر پہلے اجمیر شریف اور پھر دہلی آئے۔ اور ۱۲۴۱ھ کے آغاز میں دیوبند، سہارنپور، پانی پت، کرنال، تھانیسر وغیرہ سے گزرتے ہوئے مالیر کوٹلہ پہنچے۔ وہاں سے ممدوٹ، بہاولپور، حیدر آباد (سندھ) شکارپور، جاگن، خان گڑھ، درہ ڈھاڈر، درہ بولان، پشین، قندھار اور کابل سے گزرتے ہوئے براہ خیبر پشاور آئے۔ پشاور سے ہشت نگر گئے اور وہاں موضع خویشگی میں قیام فرمایا۔ پھر نوشہرہ تشریف لے گئے۔ دوسری جماعت جو ان کے پیچھے تیار ہو رہی تھی۔ ان کو دعاۃ کا کام سپرد کیا گیا۔

الغرض ۱۲۴۱ھ میں ہجرت شروع ہوئی اور ۲ جمادی الآخر ۱۲۴۲ھ (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) کو افغانی

(باقی حاشیہ) منیڈو ضلع علی گڑھ میں رہتے تھے۔ بہت سے فضلاء و اکابر کے صحبت یافتہ تھے۔ سن کا التزام کرتے ہوئے حدیث کی طرح خاندان ولی اللہی کے بزرگوں اور اکابر سلسلہ دیوبند کے حالات و واقعات سناتے۔ آپ کا کوئی جلسہ بمشکل اس تذکرہ سے خالی ہوتا، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے مولوی حبیب احمد کیرانوی کے ذریعہ ان کی زبانی روایات کو قلمبند کرا لیا اور اس مجموعہ کو امیر الروایات کے نام سے شائع کرایا۔ بعد میں مولانا طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے جمع کردہ حالات، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا تھانوی کے ملفوظات اور بعض دوسرے اضافات کے ساتھ یہ مجموعہ ارواح ثلثہ کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں سید صاحب شاہ اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب کے متعلق نہایت کارآمد معلومات کا ذخیرہ ہے۔ سیرت سید احمد ص ۲۷ و ش۔م۔ ص ۳۸۹)

امیر الروایات کی مذکورہ بالا حکایت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ اجتماع ایک مرکز رکھتا ہے تو وہ شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ ہے اور شاہ اسحاق اس کے رئیس تھے۔ امیر شہید چونکہ عسکری نظام کے سردار تھے اور وہ زمانہ لشکر جمع کرنے کا تھا اس لیے بیرون مدرسہ ان کو صدارت حاصل تھی۔

قبائل نے بھی "ہنڈ"[1] کے مقام پر سید احمد شہید کو اپنا امیر مان لیا۔ اس کے بعد ایک سال تک مولانا عبدالحی زندہ رہے۔ انکی موجودگی میں کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوا۔ سید احمد شہیدؒ کے سامنے اپنی ذاتی رائے[2] پر عمل نہیں کر

---

[1] ہنڈ کا تعلق ہماری سیاسی تاریخ سے نہایت قوی ہے۔ یہ ہنڈ وہی مقام ہے جہاں ۱۲ جمادی الآخر ۱۲۴۲ھ فرقہ "ولی اللہیہ" کے "مقدمۃ الجیوش" نے جسے امام عبدالعزیز نے تیار کیا تھا، اپنی حکومت موقتہ قائم کی۔ اس کے رئیس امیر شہید تھے۔ جمہور مسلمین نے بیعت کی اور انہیں امیر مان لیا گیا۔ اتفاق سے یہ تاریخ ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء کے موافق تھی، اس لیے ہمارا شمسی قومی نوروز اس واقعہ کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ۱۰ جنوری کو منایا جائے گا۔ جس قدر ہندوستانی مسلمان کی قومی روح تازہ ہو گی اسی انداز سے وہ ہماری تجویز کی تائید کریں گے۔

سر جان ایلیٹ نے لکھا ہے کہ ہنڈ دریائے سندھ کے کنارے مشہور و معروف مقام ہے۔ یہ اٹک سے پندرہ میل کے فاصلے پر لاہور اور پشاور کی قدیم شاہراہ پر پشاور سے تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہنڈ مشرقی قندھار کا دارالسلطنت تھا۔ ابوالفداء، البیرونی، بیہقی نے سکندر اعظم کو اس کا بانی قرار دیا۔ اسکو بھنڈ سے یاد کیا گیا ہے۔ اب اسکو ہنڈ کہتے ہیں

[2] سید احمد شہید ایک روز صبح کی نماز میں دوسری رکعت میں آکر شریک ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر مولانا عبدالحی نے "مابال اقوام الخ" کے طور پر فرمایا کہ ایسے لوگ جو سنت کے احیاء کے مدعی ہیں، وہ جماعت میں بھی صحیح طور پر حاضر نہیں ہو سکتے۔

سید صاحب نے فرمایا۔ مولانا! آپ کا ارشاد حق ہے۔ ہم سے پھر ایسی کوتاہی نہیں ہو گی۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس طرح ٹوکیں۔ مولانا عبدالحی نے کہا کہ یہ عذر صحیح نہیں ہے آپ کو صحیح طور پہ کام کرنا چاہیئے۔ ہر روز کون ٹوک سکتا ہے؟ امام بنتے ہو تو آگے بڑھ کر کام کرو۔

جب مولانا عبدالحی کا آخری وقت تھا تو سید صاحب نے ان سے فرمایا کہ مولانا آپ کی اگر کوئی خواہش ہو تو میں اس کو پورا کر دوں۔ آپ نے کہا آپ اپنا قدم اٹھا کر میرے سینے پر رکھیں یہی ایک خواہش باقی ہے۔ سید صاحب نے اسکی تعمیل کر دی۔ الغرض ادب بھی انتہا درجے کا ملحوظ ہے اور ان کو قاعدے کے اندر پابند رکھنے کی بھی قوت ہے۔

یہ ہر دو واقعہ ہمیں مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے سنائے۔ غالباً انہوں نے مولانا محمد قاسمؒ یا مولانا رشید احمد صاحب سے سنے ہوں گے۔

سکتے تھے، بلکہ اجتماعی فیصلہ پر حکومت کا تمام تر دار و مدار تھا۔

شعبان ۱۲۴۳ھ بروز یکشنبہ مولانا عبدالحی نے انتقال فرمایا۔ اس سے مجاہدین کی جماعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ نیز ان کی وفات کے بعد ولی اللہی تحریک میں ایک اساسی تغیر رونما ہوا جس کے نتائج آگے چل کر بڑے دُور رس ثابت ہوئے۔ اب تک اس تحریک کے پیشِ نظر یہ تھا کہ سلطنت دہلی کے بجائے جس کا نظام بالکل فرسودہ ہو چکا تھا، امام ولی اللہ کے انقلابی پروگرام کو عملی شکل دی جائے۔ اسی مقصد کی خاطر شاہ ولی اللہ نے مرہٹوں کے زور کو توڑنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو بلوایا تھا۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز چاہتے تھے کہ سکھوں کے خلاف جو پنجاب پر قابض تھے، افغانوں سے مدد لی جائے اور پنجاب کی اس باغی حکومت کو ختم کر کے کابل اور دہلی کا پھر سے اتصال قائم کر دیا جائے۔ کیونکہ مستقبل کی ترقی کا سارا انحصار اسی پر تھا چنانچہ اسی مقصد کو بار آور کرنے کے لیے یہ ساری جد و جہد کی جا رہی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ولی اللہی تحریک کا دہلی اور ہندوستان سے خصوصی تعلق تھا، اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے اصولوں پر حکومت قائم کرنا حزب ولی اللہ کے بنیادی اصولوں میں داخل تھا چنانچہ دہلی کو اس تحریک میں مرکزی حیثیت حاصل تھی سید صاحب اور ان کی مجاہدین کی جماعت دہلی ہی کے مرکز کی تابع تھی اور ان کو روپیہ اور آدمی بھی دہلی سے بھیجے جاتے تھے۔ لیکن مولانا عبدالحی کے انتقال کے بعد ولی اللہی تحریک کی اس خصوصیت میں فرق آگیا اور دہلی سے سرکشی اور بغاوت کے آثار پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ دریائے سندھ سے اُدھر جو مؤقتہ حکومت بنی تھی وُہ ایک مستقل مرکز کی حیثیت اختیار کر کے دہلی کی حریف بننے لگی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ حزب ولی اللہ کا جو طریقۂ حکومت تھا بدل گیا اور بورڈ کی امامت کی جگہ شخصی امارت (ڈکٹیٹرشپ) نے لے لی۔ سیّد احمد شہید امیر المومنین اور دنیائے اسلام کے مصلح خلیفہ مانے جانے لگے۔ اب وُہ ساری دنیا کے ایک بڑے امیر بن گئے۔ چنانچہ اگر افغانی سرداروں کے لیے ان کی اطاعت مذہبی فرض تھی تو بخارا، ٹرکی اور دوسرے ممالک بھی انکی اطاعت سے سبکدوش نہیں ہو سکتے تھے۔ مختصراً ان کو تسلیم کرنا دنیا کے سب مسلمانوں کا مذہبی فریضہ بن گیا اور اس کی وجہ سے مرکز یعنی دہلی کی خصوصی حیثیت جاتی رہی۔

---

[1] ہمارے خیال میں اس تغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کی ڈپلومیٹک چالوں کو بڑا دخل ہے۔

اس اساسی تغیر سے یہ بھی ہوا کہ حنفی فقہ کے بارے میں حزب ولی اللہ کی جو خصوصیات تھیں، ان پر زور نہ دیا جاتا۔ بلکہ نجدی اور یمنی طریقوں پر کام کرنے والے ہندوستانی تو حنفی فقہ کی پابندی بھی اپنے لئے ضروری نہ سمجھتے۔ اس کی وجہ سے افغانوں کی ان مجاہدین سے بھی مذہبی عداوت ہو گئی۔ گو امیر سید احمد شہید نے بار ہا علماء سے افاغنہ اور عوام کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ امیر اور خاندان ہمیشہ سے محققین حنفیہ کے طریقہ کا پابند رہا ہے، مگر یہ لوگ تھے کہ اس معاملے میں حزب ولی اللہ کی امتیازی خصوصیت کی پابندی کو قبول نہ کرتے۔ چنانچہ اسی طرح معاملہ روز بروز بگڑتا چلا گیا۔

ولی اللہی تحریک کے اس دور میں حنفی فقہ کی پابندی اور عدم پابندی کے مسئلے نے بڑی خطرناک شکل اختیار کر لی تھی۔ اس بنا پر اس تحریک کو ایک طرف افغانوں میں اور دوسری طرف عوام ہندوستانی مسلمانوں میں بھی بڑے زوروں سے بدنام کیا گیا۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے کچھ تفصیل کی ضرورت ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ امام ولی اللہ اگرچہ اپنے والد کی طرح حنفی مذہب کے پابند تھے، مگر وہ حنفی اور شافعی دونوں مذہبوں کی کتابیں محققین کی طرح پڑھاتے تھے۔ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے اصولِ حکمت کے مطابق حدیث کی شرح لکھی ہے۔ اس میں بعض اوقات وہ شافعی مذہب کو اگر وہ حدیث اور حکمت سے زیادہ مطابق ہوتا راجح قرار دیتے ہیں۔

حنفی فقہ کے متعلق شاہ ولی اللہ کا اپنا مسلک بالکل صاف اور واضح ہے۔

– "انفاس العارفین" میں وہ اپنے والد کے متعلق فرماتے ہیں "یہ بات مخفی نہ رہے کہ حضرت اکثر امور میں حنفی مذہب کے مطابق عمل فرماتے تھے۔ سوائے چند ایک چیزوں کے جن میں وہ حدیث یا اپنے وجدان کی بنا پر دوسرے مذہب کو ترجیح دیتے۔ ان میں سے ایک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہے۔"

اپنی دوسری کتاب "فیوض الحرمین" میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں توجہ کی اور ان سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ وہ مذہب فقہ میں کس مذہب کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہیں تاکہ اسی کو مضبوطی سے پکڑ لوں۔ چنانچہ مجھ پر یہ کھلا کہ آپ کے نزدیک سب کے سب مذاہب برابر ہیں۔ اور آپ کی روح اقدس کو اس حالت میں فروعات کے معلوم

کرنے کا خیال نہیں۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے مجھے حنفی مذہب کا ایک ایسا عمدہ طریقہ بتایا جو ان حدیثوں سے جن کو بخاری اور ان کے ساتھیوں نے جمع کیا اور انکی جانچ پڑتال کی، زیادہ قریب اور موافق ہے۔ وہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد ان تینوں کے اقوال میں سے وہ قول قبول کیا جائے۔ جو حدیث سے زیادہ قریب ہو۔ ان کے بعد حنفی فقہا میں سے ان کی بات تسلیم کی جائے، جو فقہ کے ساتھ ساتھ حدیث کے بھی عالم ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلے میں امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی خاموش رہے ہوں اور حدیث نے اس مسئلے کی صراحت کر دی ہو تو اس حالت میں ضروری ہے کہ اس مسئلے کو قبول کر لیا جائے اور یہ طریقہ بھی مذہب حنفی میں شامل ہے۔

اسی کتاب کے صفحہ ۶۲ پر فرماتے ہیں پھر مجھ پر ایک اور فیضان ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کے شیرازہ کو جمع کرے۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ فروعات میں اپنی قوم کی کبھی مخالفت نہ کرو۔ اگر تم اس طرح مخالفت کرو گے تو گویا اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف[1] چلو گے۔

امام ولی اللہ کی عام دعوت اور ان کے حکیمانہ فکر کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جہاں تک ذہنی اعتبار سے ان کی تعلیمات و افکار کا سوال ہے، ان کا مخاطب انسانیت کا اعلیٰ طبقہ ہے۔ اور چونکہ وہ تمام دنیا میں ایک ہی رنگ رکھتا ہے، اس لیے شاہ ولی اللہ کی باتیں دوسرے ممالک والے بھی اسی طرح مان سکتے ہیں جیسے ہندوستان والے۔ لیکن امام ولی اللہ نے عملی طور پر اپنی اس عمومی دعوت کو ہندوستان کے لیے خاص کر دیا تھا۔ اسی لیے وہ حجاز چھوڑ کر ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ ظاہر ہے ہندوستان میں حنفی فقہ کی پابندی ایک حد تک ضروری تھی۔ امام ولی اللہ کے بعد شاہ عبدالعزیز نے خاص طور پر اپنے

---

[1] مولانا محمد فاخر الہ آبادی ایک دفعہ دہلی تشریف لائے۔ شاہ ولی اللہ صاحب سے ملاقات کرنا مقصد تھا۔ اتفاقاً ایک مسجد میں نماز پڑھی اور رفع یدین کر بیٹھے۔ عوام ان کے سر ہو گئے۔ نزاع نے نازک صورت اختیار کر لی۔ ہجوم ان کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے آیا۔ آپ نے برافروختہ ہجوم سے نہایت نرمی سے فرمایا کہ احادیث صحیحہ میں اس طرح بھی وارد ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو کر چلے گئے۔ بعد ازاں شاہ صاحب نے مولانا سے فرمایا۔ حکیم وہ نہیں جو عوام کو خواہ مخواہ اپنے خلاف کرے۔

ملک کے متوسط طبقے اور عوام کو مخاطب بنایا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح امام ولی اللہ کے علوم ان کے ذہنوں میں راسخ کر دیں۔ اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ فقہ حنفی اور فقہ شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں اور شاہ عبدالعزیز فقہ حنفی سے آگے نہیں بڑھتے۔ لیکن یہ قید صرف مخاطبین کی ضرورت کی وجہ سے تھی، ورنہ جہاں تک اُن کی طبیعت، نیز خصوصی ماحول مثلاً خاندان اور خاص تلامذہ کا تعلق تھا، وہ عملی طور پر اپنے فکر کی بلند سطح سے نیچے اُترنے پر مجبور نہ تھے۔ لیکن ضرورت تھی متوسط طبقہ کو سمجھانے کی، اور ہر ملک کا متوسط طبقہ جُدا ہوتا ہے۔ اس لیے شاہ عبدالعزیز کے طریقے میں ملک کے متوسط طبقے کی خصوصیات کا آنا لازمی تھا۔

حنفی فقہ اور فروعات کے معاملے میں ہندوستان کی قومی روایات کے پیشِ نظر حزب ولی اللہ کا یہ مسلک تھا۔ جب مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے "حجۃ اللہ" امام عبدالعزیز سے پڑھی۔ تو اپنے جدِ امجد شاہ ولی اللہ کے طریقہ پر عمل کرنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی جو حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرے۔ یہ لوگ شافعیہ کی طرح "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" کرتے تھے، جیسا کہ سُنن میں مروی ہے۔ اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی، مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کی جماعت پر معترض نہ ہو سکتا تھا۔ بعد میں جب افغانی علاقہ میں ہجرت کا فیصلہ ہوا تو امیر شہید نے مولانا اسمٰعیل سے دریافت کیا کہ مولانا! آپ "رفع یدین" کیوں کرتے ہیں؟ مولانا نے کہا۔ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے۔ امیر شہید نے کہا کہ مولانا! اب رضائے الٰہی کے لیے "رفع یدین" کرنا چھوڑ دیجیے۔ اس کے بعد مولانا شہید کی خاص جماعت نے بھی اُن کی اطاعت میں یہ اعمال چھوڑ دیے[1]۔

مگر وہ لوگ جو نجدی اور یمنی علماء کے شاگرد تھے، باز نہ آئے۔ انہی لوگوں کے بیجا اصرار نے مشکلات پیدا کر دیں۔ امیر شہید نے ان کے رہنما کو جو مولانا محمد اسمٰعیل اور امام شوکانی دونوں کا شاگرد اور زیدی شیعہ تھا، اپنی جماعت سے نکلوا دیا۔ مگر فساد کی آگ پھر بھی بھڑکتی رہی۔

ولی اللہی تحریک کی اس منزل پر نجدی اور یمنی علماء کے ہندوستانی شاگردوں اور حزب

---

[1] یہ روایت امیر شاہ خاں مرحوم کی زبانی ہم تک پہنچی ہے۔

ولی اللہ میں جو نزاع پیدا ہوا، اس کی ایک اصولی حیثیت اور بھی تھی۔ یہ دراصل اختلاف تھا دو رجحانات میں۔ زمانۂ حال کی اصطلاح میں ایک رجحان تھا نیشنل اور دوسرا تھا انٹرنیشنل۔ آج کل یورپ کی سیاست میں ایک ہی تحریک کی نیشنل اور انٹرنیشنل جماعتوں کے اختلافات مرکزی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک ملک میں ایک نیشنل پارٹی ہوتی ہے، جو انٹرنیشنل رجحانات رکھتی ہے۔ اس کے برعکس دوسری پارٹی انٹرنیشنل نظریہ کو اپنا اولین اساس بناتی ہے۔ عام لوگ تو ان دونوں میں فرق نہیں کرتے مگر یہ جماعتیں آپس میں کبھی مل کر کام نہیں کر سکتیں، بلکہ غالب پارٹی مغلوب جماعت کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یوں سمجھنا چاہیے کہ حزب ولی اللہ ایک نیشنل پارٹی تھی جو انٹرنیشنل رجحانات رکھتی تھی اور وہ ہندوستانی جو نجدی اور یمنی ذہنیت رکھتے ہیں، انکو ایسی پارٹی سمجھنا چاہیے جو انٹرنیشنل نقطۂ نظر کو اساسِ اولین قرار دیتی ہے۔ افغان قومیں چونکہ خالص نیشنل پروگرام مانتی تھیں، وہ حزب ولی اللہ کے معتدل حلقے سے تو متحد ہو سکتی تھیں، مگر انٹرنیشنل اصول کو اساسِ اول ماننے والے لوگوں کے ساتھ نہیں مل سکتی تھیں۔

---

[1] روس کے اشتراکیوں میں ایک ٹروٹسکی جماعت تھی، جو انٹرنیشنل نظریہ رکھتی تھی۔ ٹروٹسکی یہودی النسل تھا۔ اس کے مقابلے میں سٹالن کی جماعت نیشنل پارٹی ہے۔ لیکن انٹرنیشنل میلان رکھتی ہے۔ سٹالن خالص روسی ہے چنانچہ اس کو جب موقع ملا تو اس نے ٹروٹسکی کی ساری جماعت کو جو عموماً یہودی تھے قتل کرا دیا۔ اسی طرح اسلام ایک انٹرنیشنل تحریک ہے۔ اور عربی، ترکی، ایرانی اور ہندوستانی نیشنل تحریکیں ہیں۔ ایک عرب جو اسلامی میلان رکھتا ہے یا ایک ہندوستانی جو اتحادِ اسلام کے فکر کو مانتا ہے، یہ تو مثال ہوگی سٹالن کی۔ ایک ایسا آدمی جو سوائے اتحادِ اسلام کے اور کوئی چیز نہیں مانتا جیسے یمنی نجدی تحریکوں سے متاثر ہندوستانی، یہ مثال ہے ٹروٹسکی کی۔ کیونکہ وہ اسلام کے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں مانتے۔ ہندوستانیت، عربیت وغیرہ ان کے ہاں کوئی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا ہر دو جماعتوں میں یعنی امام عبدالعزیز کی تربیت یافتہ جماعت اور یمنی نجدی طریقے پر چلنے والے ہندوستانیوں میں اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔

فکری اعتبار سے ایک تو یہ نزاع تھا، جو اس وقت ایک طرف افغانوں میں اور دوسری طرف نجدی اور یمنی ذہنیت سے متاثر ہندوستانیوں میں پیدا ہو گیا۔ لیکن عملی زندگی میں بھی اس کی وجہ سے بعض قباحتیں ظاہر ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ افغان شرفاء دوسری مسلم قوموں کے شرفاء سے رشتہ ناطہ کرنا معیوب[1] نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ہندوستانی مہاجرین اپنے ساتھ اہل و عیال تو لے نہیں گئے تھے، اس لئے جب یہ لوگ مستقل طور پر افغانی علاقہ میں رہنے لگے تو ان کی شادی بیاہ افغانوں کے ساتھ ہونے لگے۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ امیر شہید کے دعوائے خلافت کی اشاعت کرنے والے ہندوستانی اپنی حاکمانہ قوت دکھا کر بہ جبر[2] افغان لڑکیوں سے نکاح کرنے لگے۔ اس بارے میں بھی زیادہ مجرم وہی ہیں جو حزب ولی اللہ کے تربیت یافتہ سپاہی نہیں تھے۔ یہ لوگ مذہبی جوش میں اپنے عقیدہ و فکر کے مقابلے میں امیر کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں نے لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِیَةِ الخَالِق (جس حکم سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو، اسکے بارے میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کرنی چاہیئے۔) کا اصول[3] غلط طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ انکی مثال یورپ کے انارکسٹوں کی سی تھی جو انقلابی جماعت کے ساتھ شریک تو ہو جاتے ہیں لیکن ان سے انقلابیوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

---

[1] ۱۲۴۳ھ میں امیر شہید نے ایک خاتون سے نکاح کیا جس کو سلیمان بادشاہ کاشغر نے سید صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادی ہاجرہ پیدا ہوئی۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد یہ خاتون ٹونک چلی آئیں سن ۱۳۰۰ھ میں ٹونک میں وفات پائی۔ ش۔ م ص ۲۸۱

[2] افغان لڑکیوں سے بہ جبر نکاح کرنا کا واقعہ سیرت احمدیہ میں ان گول مول الفاظ میں مذکور ہے۔ "ہندوستان کے عام خاندانوں کی طرح افغانستان اور سرحد میں عام رواج تھا کہ بیوگان کا نکاح ثانی ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اسکے علاوہ خود نکاح میں اس قسم کی پابندیاں عائد تھیں کہ کنواری لڑکیاں بیٹھے بیٹھے عمر گزار دیتی تھیں۔ سید صاحب نے نکاح بیوگاں اور دوسری بُری رسموں کے قلع قمع کے لیے حکم دیا۔ اس سے بہت سے خاندان اور امراء ناراض ہوئے۔ ان کی مخالفت کے اسباب میں سے ایک یہ بھی بڑا سبب تھا۔" صفحہ ۱۸۹

[3] حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے مذاق کے مخالف کوئی حکم بھی ہو، اس کو نہیں مانتے۔ خواہ وہ حکم امیر ہی کیوں نہ دے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس دن سیّد احمد شہید افغانوں کے امیر بنے۔ اس کے ساتھ ہی اس اجتماع میں بغاوت کی چنگاری بھڑک اٹھی۔ اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم افغانوں کا امیر ایک افغان کو بناتے اور یہ افغان امیر شہید کے بورڈ کا ایک ممبر مقرر کر دیا جاتا۔ اس طرح دونوں قومیں مل کر جہاد کرتیں اور آپس میں مخاصمت پیدا نہ ہوتی۔ ہم نے اپنے اس فکر کا خود عملی تجربہ کر کے دیکھا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سے وہ تمام فسادات رُک جاتے، جو امیر شہید کی جماعت کے لیے سوہانِ روح بنے رہتے۔ اپنے زمانۂ قیامِ کابل میں جب ہم افغانی حکومت کے اندر رہ کر کام کرتے تھے تو ہمارے دست و بازو ہندوستانی دونوں قوموں کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ ہم نے ان میں اس طرح کے اختلافات پیدا ہوتے دیکھے، جیسے امیر شہید کے لشکر میں پیدا ہو چکے تھے، ہم نے ان کا انسداد اس طرح کیا کہ افغانوں پر کسی غیر افغان کو سردار بننے نہ دیا۔ لیکن ان کی تمام ضرورتوں میں ان کے معاون رہے۔ ہم نے ان پر حکومت نہ کی، البتہ انکی امداد کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے سارے معاملات درست رہ سکے۔

سنہ ۱۲۴۳ھ ۱۲ جمادی الثانی کو سیّد احمد کے ہاتھ پر امامت اور خلافت کی بیعت ہوئی اور آپ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اعلانِ امامت کے چند روز بعد سردارانِ پشاور لشکر اور توپ خانہ لے کر نوشہرہ کے قریب "سرائی" مقام پر سکھوں[1] کے خلاف جہاد کرنے کے لیے سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس وقت سردارانِ پشاور، سردارانِ سمہ اور مجاہدینِ ہند کی مجموعی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی، جو امیر شہید کے حکم پہ سر قربانی کرنے کو تیار تھی، سردارانِ پشاور گو بظاہر سید صاحب کے ہمراہ تھے، مگر آپکی امامت کو اپنی سرداری کے لیے پیامِ مرگ سمجھتے تھے۔ اس بنا پر وہ سکھوں سے بھی ساز باز رکھتے تھے تاکہ ان کی سرداری بہر حال باقی رہ سکے۔ عین اس وقت جبکہ میدانِ کارزار گرم ہونے والا تھا۔ اور صفیں آراستہ ہو چکی تھیں، مولانا اسمٰعیل سید صاحب کو لینے کے

---

[1] یہ یاد رہے کہ جب ہم ہندوستان سے نکلے تھے تو اتحادِ اسلام کے حامی تھے یعنی انٹرنیشنل پروگرام رکھتے تھے۔ مگر جب ہم واپس آئے تو اس وقت خالص نیشنلسٹ تھے۔ یہ سبق ہمیں کابل کی زندگی نے سکھایا ہے۔

لیے خیمہ میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سید صاحب بیہوش پڑے ہیں اور قے جاری ہے۔ بظاہر یہ زہر کا اثر معلوم ہوتا تھا، جو قے کے ساتھ خارج ہو رہا تھا۔ ادھر جب لڑائی شروع ہوئی تو سرداران پشاور کے جو دستے پہاڑیوں سے سکھوں پر بندوقوں اور توپوں سے فائر کر رہے تھے، افسوس کہ ان میں خالی بارود بھری جاتی تھی۔ سید صاحب کو میدان جنگ میں گئے مگر زہر کی وجہ سے آپ پر آٹھ روز تک بیہوشی طاری رہی۔ سازش کے متعلق جب تفتیش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ زہر کھلانے والے ولی محمد اور نذر محمد کشمیری شیعہ تھے جو یار محمد خان سردار پشاور کے نوکر تھے اور کھانا پکانے کے لیے یار محمد نے ان کو امیر شہید کے پاس بھیجا تھا۔ انہوں نے کھچڑی اور گنڈیریوں میں زہر ملا کر سید صاحب کو عین جنگ کے وقت کھلا دیا۔ امیر شہید نے گرفتاری کے بعد ہر دو مجرموں کو معاف کر دیا۔ سرداران پشاور کی غداری کے بعد آپ نے تبلیغ و تالیف قلوب کا سلسلہ وسیع کر دیا، تاکہ عامۃ الناس کے قلوب کو ادھر مائل کیا جا سکے۔ چنانچہ آپ نے مع فوج کے علاقہ بنیر سوات وغیرہ کا دورہ کیا۔[۱]

ان فتنوں کے باوجود سکھوں سے بھی لڑائیاں ہوتی رہیں اور مجاہدین کو افغانوں سے بھی لڑنا پڑا۔ ڈمگہ کے مقام پر مولانا شہید کی قیادت میں ہری سنگھ نلوہ کی فوج پر شبخون مارا گیا۔ جس میں تین سو سکھ اور سات مجاہد کام آئے۔ بعد ازاں جنگ شنگاری واقع ہوئی۔ مجاہدین ڈمگہ جب روانہ ہو چکے اور ابھی باقی ماندہ حضرات کھانے پینے میں مصروف تھے کہ سکھوں کے بڑے لشکر نے حملہ کر دیا۔ حضرت شہید نے بارہ آدمیوں کو لے کر ان پر حملہ کیا جس میں تقریباً سو سکھ مارے گئے اور یہ بارہ آدمی سلامت رہے البتہ مولانا شہید کی انگلی پر گولی لگی۔[۲]

بدقسمتی سے سرداران پشاور کا جذبۂ عناد بڑھتا ہی گیا۔ ایک دفعہ وہ چار ہزار فوج اور دو توپیں لے کر دریائے لنڈا کو عبور کر کے بمقام اتمان زئی آ پہنچے۔ امیر شہید بمقام خار قیام فرما تھے سید صاحب نے ارباب بہرام خاں، ارباب جمعہ خاں وغیرہ خوانین اور سمہ و سوات کے سرداروں سے

---

[۱] شیخ محسن ص ۴۳۱ [۲] شیخ محسن ص ۴۳۴

مشورہ کرکے دو جانب سے سردارانِ پشاور کے لشکر پر شبخون مارا۔ غنیم کو شکست ہوئی۔ اس کے علاوہ خادی خاں کی بغاوت، انٹورا فرانسیسی کی جنگ، جسے سکھوں نے فوج کی کمان دے کر بھیجا، اور اس نے شکست کھائی اور شبخون ہنڈ میں خادی خاں گولی کا نشانہ بنا، وغیرہ اور واقعات رونما ہوئے۔

خادی خاں کے قتل کے بعد اس کے بھائی امیر خاں نے اندرونی طور پر سردارانِ پشاور (یار محمد خاں وغیرہ) سے سازباز شروع کر دی مگر بظاہر وہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ یار محمد خاں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر امیر خاں کی ریاست میں اپنے لشکر جمع کرنے شروع کر دیئے۔ اور بعدہ، ایک لشکر لئے مع چھ عدد توپ، ہاتھی اور اونٹ نہایت کروفر سے وہ خود بھی میدان میں آپہنچا اور اعلان جنگ کر دیا۔ چنانچہ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ کو بروز دوشنبہ یار محمد خاں کا لشکر مقام زیدہ پہنچا۔ مولانا محمد اسمعیل نے جانبازوں کا لشکر لے کر یکایک ان پر حملہ کر دیا۔ مجاہدین نے ان کی توپوں پر قبضہ کر لیا اور توپچیوں کی مشکیں کس لیں۔ یار محمد خاں عالم بے خبری میں نوگرفتار حسینوں کے ساتھ عیش و طرب میں مشغول تھا۔ وہ زخمی ہوا اور موضع دوڈھیر میں پہنچنے سے پہلے ہی ہلاک ہو گیا اور پشاور نہ پہنچ سکا۔

یار محمد خاں کی وفات کے بعد اس کا بھائی سلطان محمد خان جوشِ انتقام سے اندھا ہو گیا اور اس نے قلعۂ ہنڈ پر قبضہ کر لیا۔ سید صاحب باوجودیکہ اس وقت سکھوں سے تربیلا کے مقام پر نبرد آزما تھے، یہ خبر سنتے ہی ہنڈ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سلطان محمد خاں نے سید صاحب کی آمد کا حال سنا تو بھاگ نکلا۔ مگر سکھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور امیر خاں برادر خادی خاں کی انگیخت پردہ ہنڈ پر قابض ہو گئے۔ اسی زمانے میں ہوتی مردان کا خاں مسمی احمد خاں نکاح بیوگان اور دوسری غیر شرعی رسوم کے سلسلے میں جو نکاح کے متعلق افغانوں میں رائج تھیں، سید صاحب سے ناراض تھا۔ یہ شخص سردارانِ پشاور کے پاس پہنچا اور ان کو بھڑکا کر جنگ کے لیے تیار کیا۔ افغانوں کا یہ لشکر بڑھتے بڑھتے مہیار پہنچا۔ ادھر سید صاحب مولانا اسمعیل وغیرہ کے ساتھ خود فوج لے کر میدان میں آئے چند گھنٹے کے بعد پشاوری سرداروں کو شکست ہوئی اور وہ لوگ مردوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر

بھاگ گئے۔ مہیار کی فتح کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ پشاور کو تسخیر کیا جائے، جو ان کا مرکز تھا[1]۔ پشاور کے افغان سردار نے امیر شہید سے لڑ کر شکست کھائی اور مجاہدین کا پشاور پر قبضہ ہو گیا۔ اس کی وجہ سے حزب ولی اللہ ایک صوبہ کی حکومت پر قابض ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ علماء حکومت کے مناصب پر مقرر کیے گئے۔ ان نواح میں حزب ولی اللہ نے ایسے نمونے کی حکومت قائم کر دی، جس کی نظیر دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یہ حکومت آگے چل کر باآسانی سندھ تک وسیع ہو کر ماوراء السندہ کو انقلاب کا اپنا مستقل مرکز بنا سکتی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ شکست خوردہ افغان خاندان امیر شہید کے پاس تائب ہو کر آیا اور معافی مانگ کر اُس نے اپنا ملک واپس لینا چاہا۔ اس پر امیر شہید راضی ہو گئے۔ اس موقع پر جماعتِ مجاہدین کے خواص و عام سب کے سب متفق الکلمہ تھے کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ مولانا اسمٰعیل، ہندوستانی اور افغان اہل الرائے نے پورا زور صرف کیا کہ امیر شہید یہ غلطی نہ کریں، مگر انہوں نے کسی کی نہ مانی[2]۔

پشاور کے اس خاندان نے حکومت واپس لیتے ہی افغانوں کے قومی جذبات کو اُبھار کر ایسی سازش کھڑی کی کہ ہر ہر قریہ کے لوگوں نے ایک ہی رات میں انقلابی حکومت کے تمام سرداروں اور سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اپنے کابل کے قیام کے زمانے میں ہم نے اس فتنہ کے متعلق کافی معلومات حاصل کر

---

[1] شیخ محسن ۱۵۸ [2] "سوانحِ احمدیہ"، کا مصنف امیر شہید کا خاص دلدادہ ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر اس نے واقعات نہیں چھپائے امیر شہید پر جماعت نے جس قدر زور دیا، سب کو اس نے مفصل لکھ دیا ہے۔ بہرام خان افغان مہمند تھا۔ اس نے امیر شہید سے کہا کہ اگر آپ حکومت نہیں چلا سکتے تو مجھے امیر بنا دیجئے۔ میں اپنی قوم کے زور سے اس خاندان سے لڑوں گا۔ اور مجاہدین کے کام کیلئے آپ جس قدر امداد میرے ذمے لگائیں گے میں اسکو پورا کروں گا۔ بہرام خاں نہایت مخلص شخص تھا۔ وُہ اپنی قومی طاقت رکھتا تھا اور مولانا شہید کا خاص رفیق اور دلی دوست تھا۔ بقول مؤلف سوانح احمدیہ امیر شہید نے اسکی بھی نہ سنی۔ اوّل تو افغانوں سے ہرگز لڑنا نہیں چاہئے تھا اور جب لڑ کر مرکز فتح کر لیا تھا تو واپس دینا بہر صورت غلط تھا۔ یہ ایسی غلطی ہے کہ کوئی اہل الرائے اس کو معاف نہیں کر سکتا۔

لی ہیں۔ اس فتنہ کی ابتداء خویشگی کے اُس خان سے ہوتی ہے، جس کی لڑکی کا جبراً نکاح ہوا تھا۔ اس میں سب سے آگے آگے خٹک کا خان تھا۔ جس سے خویشگی خان نے صلح کر لی تھی۔

واقعات یوں ہیں کہ ان ہر دو خوانین کی باہمی پشتینی دشمنی تھی۔ لیکن جب خویشگی کے خان کی لڑکی کا ایک ہندوستانی سے جبراً نکاح کیا گیا تو اس نے خان خٹک سے کہا کہ میں نے اب اپنا دعویٰ چھوڑ دیا ہے۔ اب سوال ننگ افغانی کا ہے۔ ہماری اب باہمی صلح ہے۔ تم میری مدد کرو۔ خان خٹک کی نوجوان لڑکی تھی۔ یہ پیغام پہنچتے ہی اس نے اپنی دوشیزہ لڑکی کو مجلس میں بلایا۔ سرِ دربار اس کے سر سے کپڑا اتار دیا اور کہا آج سے تیری کوئی عزت باقی نہیں رہی جب تک اس افغان لڑکی کا انتقام نہیں لیا جاتا تیری عزت ہیچ ہے۔ اس کے بعد خان خٹک کی یہ لڑکی اس فتنہ کے خاتمے تک ننگے سر رہی۔ ہوتا یہ کہ رات کو ایک جماعت اس کے ساتھ جاتی اور ایک گاؤں میں عورتوں اور مردوں کو جمع کر کے پشتو میں ننگِ افغانی کے نام سے لوگوں کو بھڑکاتی۔ دوسری رات یہ دوسرے گاؤں میں جاتی۔ اس طرح اس نے تمام افغانی علاقہ میں شورش برپا کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک معین رات میں امیر شہید کے تمام مقرر کردہ اہل مناصب افغانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اور اس انقلابی حکومت کا خاتمہ ہو گیا[1]

---

[1] پشاوری عوام سلطان محمد خاں سردار پشاور وغیرہ کی عیاشی سے متنفر تھے۔ سب نے سید صاحب کو سر آنکھوں پر رکھا۔ سابقہ جنگوں میں شکست اور سید صاحب کی عوام میں بڑھتی ہوئی عقیدت نے سلطان محمد خان کی ہمت پست کر دی، اس نے ارباب فیض اللہ خاں مہمند کے ذریعے توبہ کی درخواست کی۔ جماعت کی مرضی کے خلاف آپ نے یہ درخواست بعد از دیر منظور کر لی۔ اب حاکم پشاور کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا۔ اس موقع پر ارباب بہرام خاں وغیرہ نے خود اپنے لیے درخواست کی۔ مگر سید صاحب نے پشاور کی حکومت اور ولایت کا پروانہ محمد خاں کو عطا کر کے پشاور کا حاکم بنا دیا۔ سید صاحب نے مولانا سید مظہر علی کو شہر کا قاضی مقرر کیا اور مولانا قمر الدین کو مع چند اور حضرات کے اُن کی مدد کے لیے پشاور چھوڑا۔ اب سید صاحب اور مجاہدین کی حدود حکومت سرحد کے بڑے علاقہ پر محیط ہو گئی۔ اس کے بعد سلطان محمد خان نے غداری کر کے سب سے پہلے قاضی مذکور کو مع ارباب فیض اللہ خاں کے قتل کرا دیا۔ یہ فیض اللہ خاں وہی ہے جس نے سلطان محمد خان کی توبہ منظور کرائی تھی۔ ایک رات مجاہدین نے دیکھا کہ پہاڑیوں پر اور قریہ قریہ اونچے مقامات پر آگ

(باقی اگلے صفحہ پر)

امیر شہید اس واقعہ سے کہ اُن کے مقرر کردہ قاضی، مفتی، عالم، سپاہی غرض اُن کی اس نواح کی ساری جماعت قتل کر دی گئی تھی، بہت متاثر ہوئے۔ اور موصوف نے اپنا فوجی مرکز کشمیر میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ بالاکوٹ راستہ کی ایک منزل تھی۔ یہاں سکھوں کے ولی عہد سلطنت شیر سنگھ نے مجاہدین کی جماعت پر حملہ کر دیا۔ مجاہدین ایسے میدان میں گھر چکے تھے کہ اُن کا نہ کوئی سردار باقی رہا اور نہ کوئی سپاہی جان بچا سکا۔ تحقیق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ امیر شہید کا سر کاٹ کر رنجیت سنگھ کو دکھانے کے لیے لاہور لایا گیا اور بغیر سر کے آپ کا جنازہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید کے جنازے کے ساتھ بالاکوٹ میں دفن ہوا[۱]۔

شیخ محسن نے اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں بڑی تفصیل سے اس سانحہ کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مجاہدین کے قتل عام کے بعد سید صاحب نے ارادہ کر لیا کہ اس بدنصیب سرزمین سے ہجرت کر جائیں اس وقت جس قدر مجاہدین وہاں موجود تھے، اُنکے روبرو آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اب اس سرزمین کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ نہیں بتا سکتا کہ کہاں جاؤں گا۔ میں آپ کو رُخصت دیتا ہوں، آپ مجھے رُخصت دیں۔ مجاہدین نے کہا ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اس پر آپ نے کشمیر کی جانب کوچ کا حکم دیا یہ واقعہ ماہ رجب ۱۲۴۶ھ کا ہے۔ پنجتار اور سمہ کے مخلص عقیدت مند کئی منزل تک آپ کے ساتھ گئے سید صاحب علاقہ کاغان میں پہنچے۔ وہاں سے آپ نے چار سو مجاہدین کا لشکر زیر قیادت مولانا شہید اور مولانا خیر الدین شیر کوٹی درۂ بھوگر منگ روانہ کیا۔ یہاں شیر سنگھ بیس ہزار فوج کے ساتھ مال گزاری وصول کرنے کے لیے پڑا ہوا تھا۔ مجاہدین کا شبخون کامیاب رہا اور وہاں کے لوگوں نے سکھوں کے بجائے مجاہدین کو مالیہ ادا کیا۔ جو ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ درہ مذکور سے بڑھ کر مولانا اسمٰعیل شہید نے

(بقایا حاشیہ پچھلے صفحہ سے آگے) جلائی جا رہی ہے اور عوام خوشیاں منا رہے ہیں۔ مجاہدین نے اس کا سبب دریافت کیا تو بتایا گیا کہ یہ سب سرکاری مالیہ کی ادائیگی کی تیاری ہے۔ تاکہ فصل صاف کر کے کل عشر ادا کیا جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک ہی رات میں کہیں عشاء کی نماز کے وقت، کہیں نصف شب کے وقت، کہیں صبح کی نماز کے وقت تمام مجاہدین تحصیلداروں اور حکام وغیرہ کو ذبح کر دیا گیا۔ شیخ محسن ۱۵۸

بالاکوٹ پر قبضہ کرلیا۔ ان ایام میں شیر سنگھ سردار نجف خاں رئیس مظفر آباد کے ساتھ پشاور گیا ہوا تھا مظفر آباد میں سکھوں کا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔"

مولانا اسمعیل شہید نے خیر الدین، ملا قطب الدین اور منصور خاں قندھاری کو فوج دے کر مظفر آباد روانہ کیا۔ خون ریز جنگ کے بعد مظفر آباد فتح ہوا۔ شیر سنگھ کو جب اسکی اطلاع پہنچی تو وہ گڑھی حبیب اللہ آیا جو مظفر آباد اور بالاکوٹ کے درمیان ہے۔ بالاکوٹ گویا ایک قدرتی قلعہ ہے، جس کو چاروں طرف سے بلند پہاڑیوں کی دیواروں نے گھیر رکھا ہے۔ ایک بدبخت مسلمان کی رہنمائی سے شیر سنگھ دشوار گزار دروں کو پھلانگتا ہوا ایسے مقام پہ پہنچا جہاں صرف ستر مجاہد پہرہ دے رہے تھے ان سب کو شہید کر کے شیر سنگھ کی بیس ہزار فوج ایک محصور مقام پر ہزار بارہ سو کی جماعت سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ نشیبی علاقہ میں مجاہدین تھے۔ اور بلندیوں پر سکھ۔ دست بدست لڑائی کے علاوہ سکھوں کی بھاری جمعیت پہاڑوں سے گولیوں کی بارش برسا رہی تھی۔ سید صاحب، مولانا شہید، ارباب بہرام خاں اور دوسرے مجاہدین سکھوں کی فوج میں گھس گئے اور سب نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ واقعہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعہ نماز جمعہ کے وقت کا ہے۔ شہادت کے وقت سید صاحب کی عمر ۴۶ سال کی تھی اور مولانا شہید کی عمر ۵۳ سال[1] کی تھی۔" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حکیم الہند امام ولی اللہ نے جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں، ۵ مئی ۱۷۳۱ء کو اپنا کام شروع کیا تھا جب اس تحریک پر پورے سو برس گزر چکے تو امام ولی اللہ کے بے نظیر پوتے اور ان کے رفقاء نے اس طرح معرکۂ کارزار میں شہید ہو کر تحریک کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ واقعہ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو پیش آیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں سیاسی

---

[1] شیخ محسن صفحہ ۴۷۱

اقتدار حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ مگر اب تک اس نے تجارتی لباس میں مستور رہنا ضروری سمجھا تھا۔ اس واقعہ سے دو[1] سال بعد ۱۸۲۳ء میں یہ یک لخت تجارت کا لبادہ آتار کر حکومت کی مالک بن جاتی ہے فی ذالک لعبرۃ لاولی الالباب۔

اس تحریک کے متعلق ہم نے کتاب "المسوی" کے مقدمہ میں زمانۂ قیام مکہ میں ایک حاشیہ[2] لکھا تھا اسے یہاں نقل کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ "المسوی" کا یہ نسخہ مکہ معظمہ میں طبع ہو چکا ہے۔

"امام عبدالعزیز کی تحریک ترقی کرتے کرتے ۱۲۴۲ھ میں اس قابل ہوگئی کہ اس نے ہندوستان کی سرحد پر افغانوں کے کوہستانی علاقہ میں اپنی مؤقتہ حکومت قائم کر لی۔ اس حکومتِ شرعی کی قیادت امیر المومنین سید احمد دہلوی (امیر شہید) کے سپرد ہوئی۔ صدر الوزراء مولانا عبدالحی دہلوی (صدر سعید) بنے۔ جنگی اور سیاسی امور مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی (صدر شہید) کی تحویل میں تھے۔ باقی رہے امور داخلہ مثلاً اموال کی فراہمی اور مجاہدین کی روانگی وغیرہ، انکا مرکز دہلی تھا، اور مولانا محمد اسحاق (صدر حمید) اس کے نگران تھے۔ ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ ([3]۱۰ مئی ۱۸۳۱ء) کو بالاکوٹ کے مقام پر جو کشمیر کی حدود کے قریب واقع ہے، امیر اور ان کے ساتھی شہید ہوگئے"۔ راقم عبید اللہ بن الاسلام سندھی دیوبندی۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہمارے نزدیک سرحد پار کی حکومت مؤقتہ کا قیام دراصل امام عبدالعزیز ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ بعض حلقوں کی طرف سے سید صاحب کو بڑی کشف و کرامت کا مالک بنا کر ساری جماعت کا امام منوایا گیا ہے۔ یہ چیز حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔ یہاں کشف و کرامت کا مذکور ہی کیا ہے، جماعت کے

---

[1] دو سال تک یہ لوگ انتظار میں رہے کہ آیا یہ تحریک پھر اٹھتی ہے یا نہیں۔ جب دیکھا کہ تحریک قطعاً ختم ہو چکی ہے تو انہوں نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

[2] اصل عبارت عربی میں تھی

[3] ہجری مہینے کی تاریخ محفوظ ہے۔ انگریزی جنتری کے ساتھ تطبیق دے کر پہلے ہم ۱۰ مئی ۱۸۳۱ء کرتے تھے مگر دوسری جنتریوں کی مدد سے ۶ مئی ہوتی ہے۔

اصل امام عبد العزیز تھے۔ سید صاحب تو امام عبد العزیز کی جماعت کے سپاہی تھے۔ بے شک وہ فوجی جرنیل کے فرائض اچھی طرح ادا کر سکتے تھے۔ ان سے غلطی ہوئی، خدا تعالیٰ انہیں معاف کرے۔ ہم تو درحقیقت اصل شاہ عبد العزیز کو مانتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ سید صاحب کی بزرگی میں مولانا عبد الحی اور مولانا محمد اسمٰعیل کا اشتراک ہے۔ کیا ان کو سید صاحب نے تیار کیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو امام عبد العزیز کے تربیت یافتہ تھے۔ سید صاحب کو روپیہ شاہ اسحاق بھیجتے تھے۔ کیا ان کو سید صاحب نے تیار کیا

---

[1] تحریک کے دعاۃ کا نظام شروع سے آخر تک مولانا اسحاق کے ہاتھ میں رہا" سوانح احمدیہ" کے مصنف نے امیر شہید کے مناقب اس طرح بڑھا چڑھا کر لکھے ہیں کہ مولانا محمد اسحاق کی شخصیت گم ہو گئی ہے۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ مولانا ولایت علی نے مولانا محمد اسحاق کے بالمقابل اپنی پارٹی بنائی۔ اور سوانح احمدیہ کا مصنف اس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے مگر پھر بھی اس کے قلم سے بعض واقعات ایسے نکل گئے ہیں جن سے ہمارے مطلب پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا محمد اسحاق نے ایک ہنڈی پنج تار بھیجی۔ وہاں وصول نہ ہو سکی۔ اسکی بازیافت کے لیے سیٹھ پر عدالت عالیہ آگرہ میں دعویٰ کیا گیا اور ڈگری مولانا محمد اسحاق کے نام ملی۔ مؤلف سوانح احمدیہ نے یہ واقعہ اس لیے لکھا کہ یہ تحریک برطانوی گورنمنٹ کے خلاف نہ تھی۔ براہِ دور اندیشی شیخ غلام علی رئیس اعظم الٰہ آباد کی معرفت گورنر اضلاع شمالی و مغربی کو اس تیاری جہاد کی اطلاع دی گئی جس کے جواب میں گورنر نے کہا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری سے مانع نہیں۔ مذکورہ بالا واقعہ سوانح احمدیہ میں موجود ہے۔ ہم اس ایک واقعہ کو کافی سمجھتے ہیں۔ اگر روپیہ روانہ کرنے کا انتظام شاہ اسحاق کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو عدالت میں یہ دعویٰ کس طرح کر سکتے تھے اور ڈگری کس طرح لے سکتے تھے۔

ایک واقعہ اور ہے۔ مولانا محبوب علی مجاہدین کے مرکز سے دہلی واپس آئے تو انہوں نے اس تحریک کے خلاف پروپگنڈا شروع کر دیا کہ یہ تحریک جہاد سرے سے بے سود اور غلط اقدام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سوانح احمدیہ کا مصنف لکھتا ہے کہ مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کی کوششوں سے یہ فتنہ دبا اور وہ اثر باطل ہوا۔ اور قافلوں کی روانگی باقاعدہ شروع ہو گئی۔

تھا۔ یہ سارا کام امام عبدالعزیز کا تھا۔ انہوں نے آدمی تیار کئے۔ پروگرام بنایا اور کام شروع کیا۔ پھر غلطیاں اس قدر ہوئیں کہ ان کا لازمی نتیجہ شکست تھا۔ پہلے زمانے میں ہم ان واقعات کو پڑھ کر رو دیتے اور زمانے کی شکایتیں کرتے کہ لوگ اسلام سے بہت دُور ہوگئے ہیں۔ مگر بعد میں یورپ کی انقلابی تحریکوں کی تاریخ پڑھنے سے ہمارے تمام خدشات رفع ہوگئے۔ ہم نے دیکھا کہ اس طرح کی انقلابی تحریکیں[1] باربار شکست کھاتی ہیں تب کہیں برگ و بار لاتی اور اپنی منزلِ مقصود پر پہنچتی ہیں۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ واقعہ بالاکوٹ پر امام ولی اللہؒ اور امام عبدالعزیز کی اجتماعی تحریک کا ایک دور ختم ہوگیا۔ لیکن چالاک تاریخ نویس اس واقعہ کو خود تحریک کا خاتمہ قرار دے کر امام ولی اللہؒ اور امام عبدالعزیز کے کاموں کو یہاں ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وُہ پہلے تو امیر شہید کی عظمت پر زور دے کر اُن کو ساری تحریک کا ماں باپ ثابت کرتے ہیں۔ اُنکے خیال میں اس تحریک کی اس قدر کامیابی میں نہ امام عبدالعزیز کا دخل تھا اور نہ امام ولی اللہ کا۔ اور نہ پشاور کی حکومتِ مؤقتہ کو دہلی میں مولانا محمد اسحاق کی امامت یا صدارت سے جو روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ دار تھی، کوئی تعلق تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد وُہ آسانی سے امیر سید احمد کی شہادت سے اس تحریک کے ختم ہونے کا نتیجہ نکال سکتے ہیں۔

---

[1] سوشلسٹ انقلابی تحریک سب سے پہلے فرانسیسی انقلاب کے موقع پر شروع ہوئی اور ٹوٹ گئی۔ پھر دوسری بار منظم ہوئی اور شکست کھا گئی۔ بعدازاں روس میں لینن نے اس کو تیسری بار منظم کیا اور اس کا نام اسی مناسبت سے تھرڈ انٹرنیشنل تجویز ہوا۔ کارل مارکس کے اصل نظام اور لینن کے موجودہ نظام میں بہت کچھ تبدیلی آچکی ہے۔ مگر وہی تحریک اپنے تیسرے دَور میں کامیاب ہو کر رہی اور زمین کے ایک بڑے قطعہ پر اپنی حکومت قائم کر سکی۔

ہم ولی اللہی تحریک کے اس سلسلے کو زندہ مانتے ہیں اور یہ مولانا شیخ الہند کی صحبت کا خصوصی فیض ہے۔ مولانا شیخ الہند کی صحبت میں رہ کر ہم اس تحریک کے خفیہ کاموں سے کافی واقفیت رکھتے ہیں۔

ولی اللہی تحریک کا دوسرا دور

(یہ دور الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلوی نے ۱۲۴۶ھ میں شروع کیا اور ۱۳۳۹ھ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہٗ کی وفات پر ختم ہوا)

مولانا محمد اسحاق دہلوی نے بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد گیارہ سال تک غور و فکر فرما کر امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مکمل کیا۔ ان کے اس پروگرام میں دو اصول زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) حنفی مذہب کی پابندی

(۲) ترکی سلطنت سے اتصال۔

مولانا محمد اسحاق دہلوی کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ سب سے پہلے ولی اللہی تحریک کو اس عنصر سے پاک کر دیا جائے جو امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیزؒ کے اصول اور طریقۂ کار کو کاملاً تسلیم نہیں کرتا۔ اس طرح حزب ولی اللہ کا نظام عرب کی یمنی اور نجدی تحریکوں سے علیحدہ ہو کر ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کے اہم عنصر پشتونوں کو بھی اپنے ساتھ لے سکتا ہے۔

حزب ولی اللہی کے اس نظام کو پختہ بنانے کے لیے عوام کو بتایا گیا کہ جس قدر رہنما فقہ حنفی اور ہندوستانی تصوف کو چھوڑنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ حقیقت میں شیعہ پارٹی کا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے میں حزب ولی اللہ کا متوسط طبقہ ہر ایسے انسان کو جو فقہ اور تصوف کا انکار کرتا، چھوٹا رافضی

کہتا[1] اس نظام کو اور زیادہ مستحکم بنانے کے لیے مولانا محمد اسحاق نے ترکی خلافت سے اشتراک ضروری سمجھا اور وہ اپنا مرکز مکہ معظمہ میں لے گئے۔ ظاہر ہے ان کے نزدیک اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ترکی سلطنت کے اتصال سے یمنی اور نجدی تحریکیں دوبارہ معاملہ بگاڑ نہیں سکیں گی۔

مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوبؒ[۳۲] دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علیؒ[۳۳] کی صدارت میں مولانا قطب الدینؒ[۳۴] دہلوی، مولانا مظفر حسینؒ[۳۵] کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے۔ یہی جماعت ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔ الغرض امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کو نئی نہج پر ڈالنے میں شاہ محمد اسحاق کی اس اصابت رائے کا نتیجہ تھا کہ بعد میں دہلی کے مدرسہ کے نمونہ پر دیوبند[۳۶] میں جو درس گاہ قائم کی گئی، اس نے پچاس سال کے عرصہ میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

دیوبندی نظام اور اس کی سیاسی مصلحتوں کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو مستحضر کر لینا چاہیے کہ جس دیوبندی جماعت کا تعارف ہم کرانا چاہتے ہیں، وہ اس دہلوی جماعت کا دوسرا نام ہے، جو مولانا محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد ان کے متبعین نے ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کے لیے بنائی تھی۔ اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے استاذ اساتذۃ الہند مولانا مملوک علی صدر مدرس کالج دہلی کے لیے مخصوص رہی۔ انکے بعد مولانا محمد اسحاق نے مولانا امداد اللہؒ[۳۷] کو اس کام کے لئے مقرر کیا۔ مولانا محمد اسحاق نے مکہ معظمہ پہنچ کر پوری آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس پر دولتِ عثمانیہ کی وزارت خارجہ کو ان کے اخراج

---

[1] شاہ محمد اسحاق کے متبعین جس کو اس قسم کا پاتے، عوام سے کہتے کہ یہ چھوٹا رافضی ہے۔ یہ جملہ دراصل امیر شہید کا بنایا ہوا ہے۔ مگر کثرت سے اس کا استعمال شاہ محمد اسحاق کے متبعین نے کیا۔

پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس بیرونی دباؤ کے مخمصہ[1] سے نجات حاصل کرنے کے لئے مولانا محمد اسحاق نے شیخ الحرم کو واسطہ بنایا اور ایک پناہ گیر کے طور پر حجاز میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اس اجازت کی شروط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مولانا محمد اسحاق دولت عثمانیہ کی سیاسی رہنمائی پر کاملاً اعتماد کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے پیروؤں میں سے اُن کی معاون دہلوی جماعت نے بھی اس فیصلہ کو قبول کر لیا تاکہ انہیں اپنے کام سے ربط رکھنے میں آسانی ہو۔

یہ دہلوی جماعت اُس وقت تک اپنے وطن میں کام کرتی رہی، جب تک دہلی کا شاہی اقتدار بحال رہا۔ لیکن ۱۸۵۸ء میں جب دہلی پر انگریزوں کا براہِ راست قبضہ ہو گیا تو ولی اللہی تحریک کے لیے جو اس زمانے میں تعلیمی لباس میں کام کر رہی تھی، اپنے موطن میں اپنے وجود کو سنبھالنا کسی طرح ممکن نہ رہا تو لامحالہ ان کو اپنا مرکز ایسے شہر میں منتقل کرنے کی ضرورت پڑی جو انگریزی حکومت کے قانونی احاطہ میں نہ ہو۔

۱۸۵۷ء میں اس جماعت کی مرکزی قوت میں سلطان دہلی کی طرفداری اور غیر جانبداری کی بنا پر

---

[1] حضرت سید صاحب اور مولانا شہید نے ۱۲۳۸ھ و ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۶ء و ۱۸۲۴ء میں یعنی ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک حجاز میں قیام فرمایا۔ اس سے پہلے حجاز پر ترکوں کا ۱۸۱۸ء میں کامل تسلط ہو چکا تھا۔ مولانا شہید نے نجدیوں کے پاس اپنا آدمی بھیجا تھا۔ مگر چونکہ وُہ حجاز میں نہیں آ سکتے تھے انہوں نے نامہ بر کو واپس کر دیا کہ ہم اس وقت دُعا کے سوا اور کوئی اعانت نہیں کر سکتے۔ یہ واقعہ مکہ معظمہ میں نجد کے ثقہ عالموں سے معلو

دہلوی تحریک کو جس قدر مورخ نجدی تحریک سے ملاتے ہیں اس سے موافقین تو ناواقفی کا شکار ہوئے اور مخالفین نے اپنی سیاسی شرارت کے لیے اسے وسیلہ بنایا۔

بالاکوٹ کے بعد علاوہ علمی اختلافات کے سیاسی اصول پر بھی دونوں تحریکیں نہیں مل سکتیں۔ نجدی او یمنی عرب ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوست اور ترکوں کے مخالف تھے۔ الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق نے دول عثمانیہ سے تعلق پیدا کر کے عربی تحریکوں سے قطعاً علیحدہ رہنا ضروری سمجھا۔

ایک اختلاف رونما ہوا۔ اور یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ بعد میں اس جماعت کے دہلی کے ایک مرکز کے بجائے دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سرسید[1] احمد خاں نے دہلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔ کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورا اشتراک کیے بغیر اپنا کام شروع نہیں کرسکتی تھی، اس لیے اس نے گورنمنٹ کی وفاداری کو اپنی سیاسی مصلحت کا جزو بنا لیا۔ مگر دیوبندی جماعت جو مولانا محمد اسحاق کے زمانے سے دولتِ عثمانیہ کو اپنا سیاسی رہنما مان چکی تھی، اضطراری حالات کے سوا حکومت کی کامل وفاداری کا اعلان نہ کرسکتی تھی۔ اس نے معتدل حالات میں تو برطانوی سیاسی مصالح سے غیر جانبداری کو اپنا مسلک بنایا۔ لیکن طے یہ پایا کہ جب بھی دولتِ عثمانیہ اور دولتِ برطانیہ میں لڑائی ہو تو اس وقت دیوبندی جماعت کی یہ غیر جانبداری بھی قطعاً ختم کردی جائے گی۔

ہم مولانا محمود حسن شیخ الہند کو اپنے مشائخ اربعہ مولانا امداد اللہؒ[۳۷]، مولانا محمد قاسمؒ[۳۸]، مولانا محمد یعقوب دیوبندی اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ[۳۹] کا جانشین مانتے ہیں۔ ہم اٹھارہ سال تک ان کی صحبت خاصہ میں رہ کر ان کے سیاسی مسلک کو سمجھتے اور پھر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں چنانچہ جس قدر ہم دیوبندی مسلک کو سمجھ سکے، اس کا خلاصہ ہم نے اپنے الفاظ میں لکھ دیا ہے — واللہ المستعان۔

بالاکوٹ میں امیر شہید اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کے بعد امام عبدالعزیز کی مرکزی جمعیت کا کوئی رکن بجز الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلوی کے باقی نہیں رہا۔ انہوں نے جیسا کہ پہلے بیان

---

[1] سرسید احمد خاں استاد اساتذہ الہند مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ مولانا مملوک علی نے شیخ رشید الدین سے علم حاصل کیا تھا اور وہ شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ آپ نے شاہ صاحب سے طریقۂ تحریر سیکھا اور اس میں کمال حاصل کیا۔ نیز شاہ عبدالقادر اور مولانا عبدالحی سے بھی پڑھا۔ لیکن آپ بیشتر شاہ رفیع الدین کی خدمت میں رہے۔ الغرض سید احمد دہلوی جو علی گڑھ دارالعلوم کے بانی ہیں، ولی اللہی ہیں۔

کیا جا چکا ہے، حقیقتِ حال سے واقف ہو کر اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا اور تحریک کی بقاء کے لیے راستہ بنایا۔ اور اپنی عقل اور ہمت کے مطابق تحریک کو اس پر چلایا۔ خدا نے انکی کوششوں کو قبول فرمایا۔ ان میں برکت دی۔ ان کے پیرو جیسے جیسے حالات پیش آئے، اپنے قدم آگے بڑھاتے گئے۔ اس جماعت نے تقریباً سو سال تک اسی راستے پر چلنے کی محنت برداشت کی اور اسی کا عملی نتیجہ دیوبندی نظام کی صورت میں نکلا۔

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ دہلی سے باہر جس قدر جماعتیں حزب ولی اللہؒ سے تعلق رکھتی تھیں، ان سب نے مولانا محمد اسحاق کی رہنمائی پر اتفاق کر لیا۔ بلکہ ہمیں یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ بالاکوٹ کی یہ مصیبت عظمیٰ اپنے پیچھے اپنی مستقل یادگار چھوڑ گئی اور وہ تھا جماعت میں انشقاق و اختلاف۔ اس کے بعد حزب ولی اللہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہم دہلوی (دیوبندی) جماعت کے حالات جس تفصیل سے جانتے ہیں، اس قدر پٹنہ یعنی صادق پور کی تحریک سے آشنا نہیں۔ بہر حال تتمیم مبحث کے لیے ہم یہاں صادق پوری جماعت کے مجمل حالات بیان کرتے ہیں۔

واقعہ بالاکوٹ میں بقیۃ السیف مجاہدین کو امیر شہید کا جنازہ نہ ملا۔ بات یہ ہوئی کہ سکھوں[1] نے امیر شہید کا سر کاٹنے کے بعد آپ کو مقامی مسلمانوں کی معرفت فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کرا دیا۔ مجاہدین کے ذہن سے شکست فاش کا تصور کوسوں دور تھا۔ اس لیے حالتِ اضطراب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو امیر کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض اتفاقی واقعات بھی اس کے موید بن گئے۔ امیر شہید نے بالاکوٹ کے واقعہ سے چند روز بیشتر اپنے اصحاب کو یہ وصیت

---

[1] سکھوں کا رسالہ جنازہ کے ساتھ تھا۔ شیر سنگھ نے اپنا خاص دوشالہ جنازہ پر ڈالنے کے لیے بھیجا۔ مقامی ملاؤں سے جنازہ کی نماز پڑھوائی اور فوجی اعزاز کے ساتھ انہیں دفن کرایا۔ لیکن مجاہدین اس وقت سخت پریشانی اور آشفتہ دماغی کا شکار ہو رہے تھے کیونکہ امیر مع اپنے معتمدین کے شہید ہو چکے تھے اس لیے اگر ان کو اس اعزاز اور دفن کا واقعہ معلوم نہ ہو تو چنداں بعید نہیں۔

فرمائی تھی کہ اگر بالفرض ہم کسی ضرورت کے لیے چند روز غائب ہو جائیں۔ تو آپ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنے کام پر مستقل طور پہ قائم رہیں۔ درحقیقت وُہ ان اشاروں اور کنایوں سے پیش آنے والے واقعات کے لیے ذہنوں کو تیار کر رہے تھے، مگر پریشان دماغی اس قدر سوچنے کا کب موقع دیتی ہے۔ اس طرح یہ روایت کہ امیر کہیں غائب ہو گئے ہیں، پیدا ہو گئی اور مخالفوں نے اسے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا تاکہ تحریک اپنے عمل کے اعتبار سے ختم ہو جائے۔

پٹنہ کے مولانا ولایت علی معرکہ بالاکوٹ میں موجود نہ تھے۔ موصوف مولانا اسمٰعیل شہید کی اس جماعت کے خاص رکن تھے، جو مولانا شہید نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی تھی۔ یہ لوگ رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتے۔ لیکن ہجرت کے موقع پر امیر شہید کے سمجھانے سے مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر اس جماعت کو ختم کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اب مولانا ولایت علی نے اس جماعت کے احیاء کو اپنا مقصد بنایا اور آپ نے مولانا محمد اسحاق کے اصلاحی[1] فکر کو قبول نہ کیا۔

مولانا ولایت علی نے امیر شہید کے غائب ہونے کی روایت کی آڑ میں اپنی مستقل جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے حجاز کا سفر کیا اور یمن و نجد کی عربی تحریکوں کے مطالعہ کے سلسلے میں ان ممالک کی بھی سیاحت کی۔ ان کے نزدیک ترکوں سے اتصال کے بجائے عربی تحریک سے اتصال زیادہ محبوب تھا۔ الغرض مولانا محمد اسحاق کے حجاز جانے کے بعد مولانا ولایت علی نے پٹنہ میں اپنی مستقل پارٹی کا اعلان کر دیا۔ اس کے خلاف چونکہ مولانا اسحاق نے حزب ولی اللہ کے کام چلانے کے لیے دہلی میں جو انتظام کیا تھا، اسے آپ کمپنی کے کارندوں سے مخفی رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ اور اسی غرض کے پیشِ نظر انہوں نے اپنا مرکز مولانا مملوک علی کے حوالہ کیا تھا، جو ایک سرکاری ملازم تھے اور آپ

---

[1] اصلاحی فکر یعنی حنفی مذہب کی پابندی اور ترکوں سے اتصال۔ وہ حنفی مذہب کی پابندی کو حجۃ اللہ کے خلاف اور ترکوں سے اتصال کو یمنیوں اور نجدیوں کے خلاف جانتے تھے۔

نے اپنے خاص اصحاب کی جماعت کو اُن کے تابع کر دیا تھا۔ یہ سبب تھا جس کی وجہ سے شاہ محمد اسحاق کی جماعت کے مقابلے میں مولانا ولایت علی کی پارٹی اس وقت زیادہ نمایاں[1] ہو گئی۔ وُہ ہندوستانی عالم جو کہ مذہباً زیدی شیعہ تھا اور امیر شہید نے اسے اپنی جماعت سے نکلوا دیا تھا، وُہ بھی مولانا ولایت علی کے ساتھ شامل ہو گیا۔ نواب صدیق حسن خان اسی استاد کے توسط سے امام شوکانی کے شاگرد ہیں۔ نیز مولانا نذیر حسین دہلوی اور عبداللہ غزنوی بھی مولانا ولایت علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔

مولانا ولایت علی کی پارٹی کا مرکزی فکر یہ بتایا جاتا ہے کہ امیر شہید غیر معین عرصہ کے لیے غائب ہو گئے ہیں۔ ان کے انتظار میں جہاد کی تیاری کرتے رہنا چاہیے۔ وُہ ضرور آئیں گے۔ اور انہی کی امامت میں کام کرنے سے ہمیں نجات مل سکتی ہے۔ بظاہر یہ فکر نہایت غیر معقول معلوم ہوتا ہے۔ مگر بڑے بڑے عالموں اور صوفیوں کا، جو حزب ولی اللہ سے اختصاص رکھتے ہیں، اس تحریک کی شمولیت کے سلسلے میں نام لیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ عوام (نہ کہ خواص) کو اس تحریک کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے یہ ایک سیاسی چال تھی۔

مولانا ولایت علی نے ہندوستان کے مشرقی حصے پر اپنا اثر قائم کیا اور سرحد کے افغانی پہاڑوں

---

[1] بظاہر مولانا محمد اسحاق ہندوستانی کام چھوڑ گئے تھے۔ اور ان کے بجائے مولانا ولایت علی نے کام سنبھال لیا تھا، مگر درحقیقت مولانا محمد اسحاق نے حجاز میں وہی کام کیا، جو وُہ دہلی میں کیا کرتے تھے۔ [2] نواب صدیق حسن خاں "حجج الکرامۃ" میں لکھتے ہیں "عظیم آباد (پٹنہ) اور بنگالہ کی ایک بڑی جماعت سید احمد مرحوم بریلوی کے بارے میں یہ بھی گمان رکھتی ہے کہ وُہ مہدی تھے۔ چنانچہ مرحوم کے بعض مریدوں نے چالیس حدیثیں جمع کی ہیں، جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ ہی مہدی تھے۔ یہ لوگ سید احمد مرحوم کے غائب ہونے کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وُہ سرحد پار کے پہاڑوں میں شہید نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر ان کے واپس آنے کے منتظر ہیں۔ یہ بڑی بھاری لغزش ہے۔ آخر سید مرحوم نے کب ایسا دعویٰ کیا تھا؟ اور دوبارہ آنے کا کب کہا تھا۔ بالفرض محال اگر وُہ ایسا کرتے بھی تو کوئی انکی تصدیق نہ کرتا (مولانا سندھی کی کتاب التمہید کے مسودہ سے)

میں اپنا مستقل مرکز بنایا۔ ان کی اولاد اب تک اس علاقہ میں اپنی امارت اور اپنا مرکز رکھتی ہے۔ ان کے مخالفوں کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک چھوٹے پیمانہ پر امیر شہید کی حکومتِ مؤقتہ کی یادگار ہے۔ مولانا ولایت علی کی تحریک کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ مولانا اسمٰعیل شہید کی اس خاص جماعت کو جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسی لیے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

مولانا نذیر حسین، مولانا ولایت علی کے مدرسہ صادق پور (پٹنہ) کے ابتدائی طالب علم ہیں بہار سے جب دہلی پہنچے تو مولانا محمد اسحاق اور ان کے اصحاب کی صحبت میں بیٹھے اور علمی تکمیل کی غزوۂ دہلی (۱۸۵۷ء) تک مولانا محمد اسحاق کے مسلک کے پابند رہے۔ اس کے بعد اگرچہ بہ ضرورت نجدی تحریک اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرف میلان ظاہر کرتے رہے مگر فتاویٰ عالمگیری کا شغل، ہدایہ کی تدریس اور "وحدت الوجود" کا فلسفہ، ان کی پرانی ذہنیت کا عنوان آخر تک قائم رہا۔ اگر عوارض سے قطع نظر کر لی جائے تو وہ مولانا اسمٰعیل شہید کی اس مذکورہ جماعت کے احیاء کے سوا اور کوئی مقصد نہیں رکھتے تھے۔ بہرحال اسے انگریزی حکومت کے اثرات کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے کہ مولانا احمد علی سہارنپوری کلکتہ میں اور مولانا نذیر حسین دہلی کے مرکز میں رہے تاکہ ہر ایک اپنے اپنے مرکز میں کام نہ کر سکے۔

مولانا ولایت علی کی جماعت کے دوسرے ممتاز عالم نواب صدیق حسن خاں ہیں۔ آپ کے والد ماجد حسن بن علی بن لطف اللہ حسینی تھے۔ آپ سنہ ۱۲۴۳ھ میں دہلی آئے اور شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین سے پڑھا۔ موصوف سید احمد شہید کے ساتھ رہے اور ان کی معیت میں جہاد کیا۔ آپ کا سال وفات سنہ ۱۲۵۳ھ ہے۔ خود نواب صاحب نے مولانا صدر الدین دہلوی سے تحصیلی کتابیں پڑھیں اور مولانا محمد یعقوب دہلوی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ اپنی کتاب "الحطہ" کی تصنیف تک موصوف حزب ولی اللہ کے معارف کی ترجمانی کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی سیاسی مصلحت نے ان کو امام شوکانی کے اتباع پر مجبور کیا۔

آخر میں ہم صادق پوری پارٹی کے مرکزی فکر کے متعلق مولانا شمس الحق عظیم آبادی (تلمیذ

خاص سید نذیر حسین) کی کتاب "عون المعبود" سے چند جملے نقل کر کے اس بحث کو ختم[1] کرتے ہیں۔

"اکثر عوام اور چند ایک خواص[2] کا غازی شہید امام امجد سید احمد بریلوی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ مہدی تھے۔ نیز انہوں نے میدان غزا میں شہادت نہیں پائی بلکہ وہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ وہ اب تک زندہ ہیں اور اس عالم میں موجود ہیں۔ بعض تو اس معاملے میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے انہیں مکہ معظمہ میں طواف کرتے دیکھا۔ لیکن پھر وہ یکبارگی غائب ہو گئے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ سید صاحب ضرور واپس آئیں گے۔ دراصل یہ بات غلط اور باطل ہے۔ صحیح حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب معرکۂ غزا میں شہید ہو گئے اور وہ لوگوں کی نظروں سے غائب نہیں ہوئے۔ اس سلسلے میں جو روائتیں ہیں، ان میں سے اکثر جھوٹی اور گھڑی ہوئی ہیں اور ان میں سے جو صحیح ہیں، ان کو اچھے محمل پر محمول کرنا چاہیئے۔ بدقسمتی سے امیر شہید کی زندگی اور ان کا نظروں سے غائب ہونے کے مسئلے نے ایک نزاعی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اسے اپنے عقیدہ کا جزو بنا لیا ہے، چنانچہ جو اس کو نہ مانے، یہ لوگ اس سے بحث کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی بے راہ روی کی اللہ کی ہی بارگاہ میں شکایت ہو سکتی ہے اور خود ہم اس غیر معقول اور بے بنیاد عقیدے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔"

یہ اجمالی خاکہ ہے، حزب ولی اللہ کے اس گروہ کا جو شاہ محمد اسحاق کے مسلک سے الگ

---

[1] اصل عبارت عربی میں تھی۔ یہاں اس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے

[2] چند ایک خواص سے مراد مولانا ولایت علی ہیں۔ موصوف نے بڑی مستعدی سے اس دعوت کو پھیلایا تھا اور اس میں ایک بڑی جماعت ان کے پیچھے لگ گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ جماعت رو بہ اضمحلال ہو گئی۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل اور شاہ اسحاق کے حنفی طریقے کو چھوڑنے کی ضرورت محسوس کی اور ۱۸۵۷ء کے معرکۂ دہلی میں بے تعلق رہے۔ ہم انہیں حزب صادق پوری کا نام دیتے ہیں۔

رہا اور جسے ہم حزبِ صادق پوری کا نام دیتے ہیں۔ اب شاہ محمد اسحاق کی دہلوی جماعت کا حال سنیئے۔

مولانا محمد اسحاق کی امامتِ تحریکِ ولی اللّٰہی پر ابھی پورے تیس برس نہ گزرے تھے کہ دہلی کے آخری بادشاہ کی انگریزی کمپنی سے لڑائی ہوگئی۔ گو سلطانِ دہلی کی حیثیت بظاہر ایک وظیفہ خوار رئیس کی تھی، لیکن عام لوگوں کی نظروں میں وہ اب تک سارے ہندوستان کا موروثی سلطان تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اسی کے نام سے عوام پر حکومت کرتی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورا میں منادی والا کہا کرتا تھا "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" اس لئے عوام الناس کی رائے اسے ملک کا حقیقی مالک ماننے میں تامل نہیں کرتی تھی۔

سقوطِ دہلی کا واقعہ جو ۱۸۵۷ء - ۱۸۵۸ء میں پیش آیا، اسلامی دنیا کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہماری رائے میں ہندوستانی وہی ہے جو اس ہندوستانی سلطنت کے زوال کو اپنی قومی مصیبت سمجھتا ہو۔ اس حادثۂ کبریٰ میں مولانا محمد اسحاق کی نئی جماعت پھر دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ مولانا موصوف نے جس گروہ کو اپنی نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے، اس گروہ نے ۱۸۵۷ء میں سلطان دہلی کی طرفداری کی اور شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا۔ چنانچہ امیر امداد اللّٰہ مولانا عبد الغنی، مولانا محمد یعقوب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر ولی اللّٰہی تحریک کی ہندوستانی تنظیمات کی رہنمائی کرتے رہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی صف میں علماء اور صوفیہ کا کثیر حصہ سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانبدار رہا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ اگر ایک طرف مولانا محمد اسحاق کی تنظیم کے مقابلے میں پٹنہ کی صادق پوری پارٹی قائم ہو چکی تھی تو دوسری طرف خود شاہ محمد اسحاق کے اپنے گروہ میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں پیدا ہوگئی۔ مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں[1]

---

[1] شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جن کے مسلک پر مولانا اشرف علی صاحب کاربند ہیں اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے ہیں۔

میں سے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ امام عبدالعزیز کی حزب میں انشقاق کا جو بیج بالاکوٹ کی ہزیمت کے بعد بویا گیا تھا، اس کے تلخ ثمرات کا تسلسل کسی طبقہ میں نہیں ٹوٹتا۔ جس طرح مولانا محمد اسحاق کی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی، اسی طرح امیر امداد اللہ کی جماعت میں اور پھر ان کے بعد میں مولانا شیخ الہند کی جماعت میں مخالف پارٹی کے افراد اور گروہ مخلوط چلے آتے ہیں۔ امام عبدالعزیز کی حزب سے اس قسم کے مخالف عناصر کو قطعی طور پر پاک[1] کرنے کے لیے جب تک دانش مند نوجوان کمر ہمت نہیں باندھیں گے، یہ تحریک کبھی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

قصہ کوتاہ، ولی اللہی تحریک کے دوسرے دور کی ابتداء میں مولانا محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت حجاز میں بیٹھ کر ہندوستان میں اس تحریک کے کاموں کی رہنمائی کرتی رہی۔ مولانا محمد اسحاق اور ان کے بعد امیر امداد اللہ کو مکہ معظمہ کے قیام کے دوران میں اپنی تحریک کو جاری رکھنے میں جس قدر مشکلات پیش آئیں، ان پر غالب آنا ان کے حزم اور علم کی روشن دلیل ہے۔ اور اسے امام عبدالعزیز کی تربیت سلسلہ کی برکات میں شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ حضرات امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نہ ہوتے تو کبھی اپنا کام جاری نہ رکھ سکتے۔ نیز ہم خود مکہ معظمہ[2] میں اس قسم کی زندگی کا تجربہ نہ کر چکے ہوتے۔ پھر حضرت مولانا

---

[1] ہم یہ حکم اس لیے لگاتے ہیں کہ ہم نے یورپ کی سیاسیات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے ہاں پارٹی کے نظام کو مخالف عناصر سے پاک رکھنا سب سے اوّل درجہ کا فرض ہے۔ وُہ اس بارے میں کشت و خون سے ذرہ برابر نہیں گھبراتے۔ اسی میں ان کی فلاح اور کامیابی کا راز مضمر ہے۔

[2] مکہ معظمہ میں کوئی خفیہ تحریک نہیں چلائی جا سکتی تھی اور نہ اب چلائی جا سکتی ہے، ہر کام کرنے والے کے سر پر اس قدر غیر منظم عوام کا ہجوم مسلط رہتا ہے کہ اسے سر کھجلانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ مگر پھر بھی ہم جو کام کرنا چاہتے ہیں، وُہ اپنے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ میں حیران رہ گیا، جب مجھے معلوم ہوا کہ مولانا اشرف علی صاحب جو مولانا شیخ محمد تھانوی کے مسلک کے متبع ہیں، وُہ امیر امداد اللہ کے مخصوص اصحاب میں رہ چکے ہیں۔ اس کے بعد اسی طرح مولانا شیخ الہند کے قریبی دوست حجاز کے سفر میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

شیخ الہند کے قیام مکہ معظمہ کے واقعات ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم ان اکابر کی محنت کی قدر نہ کر سکتے۔

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

۱۸۵۷ء میں جب دہلی کی سلطنت کی آخری نشانی بھی مٹ گئی تو اس کے دو سال بعد شاہ محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت نے جو اب حجاز میں مقیم تھی اور امیر امداد اللہ کی رہنمائی میں ہندوستانی کام کرتی تھی، فیصلہ کیا کہ اطرافِ دہلی میں امام عبد العزیز کے مدرسہ کے نمونہ پر ایک مدرسہ بنایا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سات سال تک مسلسل کوشش کرتے رہے، تب کہیں جا کر ۱۲۸۳ھ یعنی ۱۸۶۶ء میں سقوطِ دہلی کے نو سال بعد مدرسہ دیوبند کی تاسیس ہو سکی۔ اس کے بعد ان کی دوڑ دھوپ سے اسی طرز پر ایک مدرسہ[1] سہارنپور میں اور ایک مرادآباد میں بنا جو

(بقیہ حاشیہ)

ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے تاکہ وہ کوئی خفیہ کام نہ کر سکیں، مجھے معلوم ہے کہ وہ اس قسم کے کام کرتے رہے اور انہوں نے اس کے لیے اوقاتِ فرصت بھی نکال لیے۔ اس سے مجھے یہ قیاس کرنے میں آسانی ہوئی کہ اسی طرح امیر امداد اللہ بھی اپنے لئے وقت نکال لیتے ہوں گے۔ میں خود بھی اسی طرح کی مصیبت میں مبتلا رہا ہوں۔ اگرچہ میرا ہندوستان سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ مگر یورپ میں میرے کافی دوست موجود تھے۔ اور کابل کے لوگ بھی مجھ سے ملتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس بنا پر مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ لہٰذا اپنی ان تکالیف اور مولانا شیخ الہند کی مجبوریوں کو سامنے رکھ کر حاجی امداد اللہ صاحب کے کام کی جس قدر اہمیت میں سمجھتا ہوں، دوسرا شخص اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

[1] ۱۲۸۳ھ میں دار العلوم دیوبند کی بنا پڑی۔ اس کے فوراً بعد ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کی شاخیں قائم کی جانے لگیں۔ چنانچہ مدرسہ دیوبند کے چھ ماہ بعد سہارنپور میں ایک شاخ کھلی۔ آخر میں تو ان شاخوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس تک پہنچ گئی تھی۔ مدرسہ دیوبند میں ان (باقی اگلے صفحہ پر)

مدرسہ دیوبندہی کی شاخیں تھیں۔ اب تک شاہ محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت کی رہنمائی امیر امداد اللہؒ کے سپرد تھی اور موصوف مکہ معظمہ میں بیٹھ کر اس تحریک کو چلاتے تھے۔ جب مدرسۂ دیوبند کی تاسیس عمل میں آگئی تو اس جماعت نے مدرسہ مذکور کو اپنا مرکز بنالیا۔ اس مدرسہ کے تمام کام امیر امداد اللہؒ کی مصلحت پر چلتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیوبند کی روح دراصل امیر امداد اللہؒ کی مصلحت پر چلنا ہے۔

مدرسۂ دیوبند کا ہفت سالہ نصابِ تعلیم، مستقل نظامِ عمل اور اساسی قواعد مولانا محمد قاسم نے بنائے۔ اس طرح انہوں نے اپنی سکیم میں امام عبد العزیز کے مدرسہ اور حزب ولی اللہؒ کے مقاصد کو محفوظ کر دیا۔ اس کے بعد دوبارہ مدرسۂ دیوبند کے نصاب پر نظرِ ثانی ہوئی۔ پہلی دفعہ مولانا محمد یعقوب صاحب دیوبندی کے زمانے میں سات سال کے بجائے یہ نصاب ہشت سالہ کر دیا گیا۔ دوسری بار مولانا شیخ الہند نے تحریک جمعیت الانصار کی بناڈالی۔ الحمد للہ کہ دونوں دفعہ حزب ولی اللہؒ کی تعلیمات کی روح محفوظ رہی۔ اب جب کبھی مدرسہ کے نصاب میں ترمیم کا سوال پیدا ہوتا ہے، میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ پہلے کا ہفت سالہ نصاب تعلیم ہر حال میں محفوظ رہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ مصر وشام کی تقلید میں کہیں اس نصاب میں بھی قطع و برید نہ کر دی جائے۔ جس کی وجہ سے اس کی وہ استعداد ختم نہ ہو جائے جس کے سبب سے اب تک یہ نصاب امام ولی اللہؒ کی حکمت کے

(بقیہ حاشیہ)

شاخوں کا نظام "لامرکزی" تھا۔ یعنی یہ سب کی سب دار العلوم کے تابع اور اس کے قوانین کی مقید نہ تھیں۔ شروع شروع میں جب میں "جمعیت انصار" کی تنظیم کا کام کرتا تھا تو میری خواہش یہ تھی کہ یہ نظام "لامرکزی" کے بجائے مرکزی ہو جائے۔ لیکن میرے استاد شیخ الہند اس خیال کی طرف کم التفات فرماتے۔ اس واقعہ کے تین سال بعد مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ لامرکزی نظام کس قدر مفید تھا۔ لامرکزیت کی وجہ سے حکومت ان شاخوں کے سارے نظام کو اپنے قابو میں نہیں کر سکتی۔ بے شک مرکزیت کی وجہ سے ظاہری صورت اچھی ہو جاتی، لیکن آزادی بہرحال ظاہری صورت سے مقدم ہوتی ہے۔ (کتاب التمہید صفحہ ۱۵۶)

مطالعہ کے لیے مقدمہ بنتا رہا ہے۔

مدرسۂ دیوبند کے مرکزی فکر اور اس کی سیاسی مصلحت کے اصول امیر امداد اللہ اور ان کے رفقاء مولانا قاسمؒ مولانا رشید احمد اور مولانا محمد یعقوب دیوبندی کی جماعت نے معیّن کیے تھے۔ اس لیے دیوبندی پارٹی کی مرکزی جماعت میں وہ شخص شامل نہیں ہو سکتا، جو یہ اصول کاملاً تسلیم[1] نہ کرتا ہو۔ مدرسۂ دیوبند کا اساسی اصول یہ ہے کہ حزب ولی اللہ نے اپنے پہلے دَور میں جس قدر علوم و معارف کی اشاعت ضروری سمجھی، حنفی فقہ کی پابندی سے ان علوم و معارف کو تدریس و تصنیف کے ذریعہ زندہ رکھا جائے۔ نیز اس مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم سے جس قدر علماء تیار ہوں، وہ مساجد اور مدارس میں کام کرنے کے لیے پوری استعداد رکھتے ہوں۔ اس تعلیم کے بعد جس قدر علماء امام ولی اللہ کے جادۂ فہم اور حکمت کی حفاظت کرنا چاہیں، یا اپنے اندر حکومت کے مناصبِ عالیہ کی اہلیت پیدا کریں تو ان کے لیے کوئی خاص نصاب معین نہیں ہے۔ وہ درسی کتابوں سے فارغ ہو کر اساتذہ کی صحبت میں رہیں۔ مثلاً یہ علماء مولانا محمد قاسم کی صحبت میں امام ولی اللہ کی حکمت سے آشنا ہو سکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب دیوبندی کی رفاقت میں سیاسی اصول سمجھ سکتے تھے اور امیر امداد اللہ کی بیعت سے پارٹی میں منسلک ہو سکتے تھے۔

علاوہ ازیں مدرسۂ دیوبند کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کابل میں اپنا وقار پیدا کرے۔ اس لیے ماوراء دریائے سندھ سے جس قدر طلبہ دیوبندی نظام کے ماتحت تعلیم پائیں۔ انہیں ہدایت کر دی جائے کہ وہ اپنی قوم کے نظام اور اپنی حکومت کے آئین کو برہم[2] نہ کریں۔ جس طرح ہندوستان میں دیوبندی جماعت مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے ساتھ بالاضطرار منازعت میں مبتلا ہو گئی ہے، کوشش کی جائے کہ یہ جھگڑے دریائے سندھ سے اُدھر نہ پھیلنے پائیں۔

---

[1] مولانا اشرف علی صاحب کے اتباع کا مرکز پر قبضہ کرنا طے شدہ اُصول کے خلاف ہے۔

[2] یعنی وہاں جا کر اہل بدعت اور اہل حدیث کے رد کے جھگڑے پیدا نہ کریں۔

مدرسۂ دیوبند کے لیے ضروری ہے کہ مکّہ معظمہ کے مرکز کے توسط سے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ اپنا ربط زیادہ مستحکم کرتا رہے۔ نیز اضطراری حالات کو چھوڑ کر مدرسہ دیوبند کو چاہیے کہ حکومت انگریزی کے مصالح سے غیر جانب داری اختیار کرے۔

مدرسۂ دیوبند کی تاریخ کا پہلا دَور مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات پر ۱۳۲۳ھ میں ختم ہوتا ہے۔ اس چہل سالہ دَور کا سب سے بڑا کارنامہ علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت ہے۔ اس عہد میں مدرسۂ دیوبند کی علمی تحریک اطراف ہند سے نکل کر افغانستان و ترکستان اور حجاز اور قازان تک پہنچ گئی۔ اس اثناء میں دیوبند کے مرکزی فکر پر جس قدر بھی حملے ہوئے، خواہ وُہ نصاریٰ اور ہنود کی طرف سے ہوں یا شیعہ و مبتدعین کی طرف سے یا نجدیؔ یمنیؔ ذوق رکھنے والے ہندوستانیوں کی طرف سے، یا یورپین ذہنیت رکھنے والے نوجوانوں کی طرف سے۔ ان میں سے اکثر اعتراضات کے جوابات محققانہ اور مجادلانہ تیار ہو گئے۔

یہ مدرسۂ دیوبند کے پہلے دَور کا کارنامہ ہے۔ مدرسہ دیوبند کا دوسرا دور ۱۳۲۳ھ میں حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند کی صدارتؒ سے شروع ہوا اور ۱۳۳۹ھ میں ان کی وفات پر ختم ہوا۔ اگر امام عبدالعزیز کی وفات پر ۱۲۳۹ھ میں حزب ولی اللہ کا پہلا دَور ختم کر دیا جائے۔ اور امام ولی اللہ کے کام کی ابتداء ۱۱۴۴ھ سے پانچ سال پہلے جبکہ انہوں نے ترجمۂ قرآن لکھنا شروع کیا تھا، مان لیا جائے تو حزب ولی اللہ کا پہلا دَور بھی سو سال کا بن جاتا ہے۔ اور دوسرا دَور بھی پورے سو سال کا قرار پاتا ہے۔

مدرسۂ دیوبند کے دوسرے دَور میں سب سے پہلے مولانا شیخ الہند نے مدرسہ کے پرانے فارغ شدہ عالموں کو جمعیت انصار میں جمع کرنا شروع کیا۔ اس طرح دیوبندی نظام کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی ساری اجتماعی طاقت منظم ہو گئی اور اس نظام میں جس طرح ہندوستان کے علماء داخل ہوتے۔ اسی طرح افغانی اور ترکستانی علماء بھی شامل ہو گئے۔ نیز درجۂ تکمیل جواب تک غیر منظم صورت میں تھوڑے سے افراد پر مشتمل تھا، اس کے قواعد و ضوابط منضبط ہو گئے اور مولانا شیخ الہند

نے امام ولی اللہ اور مولانا محمد قاسم کی کتابوں کو اس درجہ کی تعلیم کا لازمی عنصر قرار دیا۔ علاوہ ازیں مدرسۂ دیوبند کو دار العلوم کے درجہ تک پہنچایا گیا اور دار الحدیث کو اس کی مرکزی درس گاہ (کالج) قرار دیا گیا۔

مولانا شیخ الہند نے ۱۹۱۴ء کی جنگِ عمومی میں ترکی کے شامل ہونے کے بعد جمعیت الانصار کے توسط سے اپنی پارٹی کی پوری طاقت کو دولتِ عثمانیہ کی تائید میں، جو اس وقت خلافتِ عثمانیہ کی حامل تھی، استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا شیخ الہند کی تحریک باوجودیکہ ایک مذہبی اساس پر مبنی تھی، دنیا کی انقلابی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ آخر انقلابِ فرانس بھی ایک مذہبی عالم کی تحریک سے شروع ہوا تھا چنانچہ اس کی وجہ سے فرانس کی انقلابی طاقت کی توہین نہیں ہو سکتی۔ ہم اس وقت مولانا شیخ الہند کی اس تحریک کی تفاصیل ان صفحات میں بیان کرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں یقین ہے کہ آنے والے دور کے مؤرخ[1] اسے نہایت صفائی سے لکھ سکیں گے۔ ہندوستان[2]، انگلستان، افغانستان اور ترکستان کی تاریخ تو اس واقعہ کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے علاوہ یورپ کی انقلابی طاقتیں بھی اس کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔

---

[1] مولانا شیخ الہند نے ہمیں کابل بھیجا۔ وہاں جا کر ہم نے شیخ الہند کی پچاس سالہ محنت کا نتیجہ دیکھا۔ امیر امان اللہ خاں کا بروئے کار آنا شیخ الہند کی جماعت کے کام کی ایک برکت ہے۔ امیر امان اللہ شکست کھا جاتے ہیں مگر ہم اس سے نہیں گھبراتے۔ ان کی شکست کا نتیجہ ہمارا وہ مستقل پروگرام ہے جسے ہم انڈین نیشنل کانگرس میں رہتے ہوئے جاری کرنا چاہتے ہیں (اس پروگرام کی تفصیل آگے آتی ہے)

[2] پہلے ہمارا خیال تھا کہ مولانا شیخ الہند کے ان واقعات کے متعلق اجمالی اشارے حاشیے میں لکھوا دیں گے جس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی لیکن بعد میں ہماری رائے بدل گئی۔ کیونکہ اس اہم معاملہ میں اشاروں سے کام نہیں نکلے گا۔ اب ہمارا فیصلہ ہے کہ اس موضوع پر انگریزی میں مستقل رسالہ لکھوائیں گے، جس میں پہلے تو شیخ الہند کا اس تحریک میں اصلی مقام کیا تھا، اسے معین

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا محمد اسحاق نے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ۱۲۳۹ھ کے بعد حزب ولی اللہ کے دوسرے دور کو دولتِ عثمانیہ کے اتصال سے شروع کیا تھا۔ بعد میں مولانا شیخ الہند کے مشائخ نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔ مگر ۱۹۱۸ء میں گزشتہ جنگِ عظیم کے موقع پر جب دولتِ عثمانیہ ساقط ہو گئی تو حزب ولی اللہ کا دوسرا دور بھی ختم[1] ہو گیا۔ مولانا شیخ الہند نے دولتِ عثمانیہ کی تائید کے لیے جو تحریک شروع کی تھی، اس کا مرکز دہلی تھا۔ اس سے ضمنی طور پر ہندوستانی انقلاب کی تائید میں ایک غیر متوقع صورت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ مولانا شیخ الہند نے اب ہندوستانی انقلاب ہی کی اس تحریک کو اپنا مستقل موضوع بنا لیا۔ اس سے ہم حزب ولی اللہ کا تیسرا دور شروع کرتے ہیں۔

مختصراً حزب ولی اللہ کا دوسرا دور مولانا محمد اسحاق دہلوی نے ۱۲۴۶ھ میں شروع کیا تھا اور ۱۳۳۹ھ یعنی ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کی وفات پر یہ دور ختم ہو گیا۔ یہاں سے ہم تیسرے دور کی ابتدا مانتے ہیں۔ چنانچہ حزب ولی اللہ کے تیسرے دور کے

(بقیہ حاشیہ) کریں گے، ہمارے نزدیک مولانا محمد قاسم حکیم الہند امام ولی اللہ کی حکمت اور انقلاب کے مجدد تھے۔ اور مولانا شیخ الہند اپنے استاد مولانا محمد قاسم کے علم و عمل کے آرگنائزر۔ اس کے بعد سر ریجی کاکس اور مسٹر مانٹیگو وغیرہ برطانوی مدبرین کے بیانات کی روشنی میں اس تحریک کی سرگرمیوں پر بحث ہو گی۔

مولانا شیخ الہند جب مالٹا میں اسیر ہوئے تو وہاں دولِ یورپ کے مختلف نمائندوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ حیران تھے کہ ایک ہندوستانی جو برطانوی "سبجکٹ" ہے، گورنمنٹ سے لڑائی کا اعلان کرتا ہے۔ وہ کس طرح سزائے موت سے بچ گیا اور پھر اسے جنگی قیدی کا اعزاز کیوں دیا گیا۔ مولانا شیخ الہند کے خدام جو یورپ میں کام کر رہے تھے، ان حکومتوں کے لوگ جب ان سے ملے تو انہیں اس تحریک کی تحقیق کا موقع ملا۔ ہم سے بھی جب کبھی یہ لوگ کابل یا یورپ میں ملے تو انہیں مسائل پر بحث کرتے رہے۔ اس رسالہ میں ان مباحث کا خلاصہ بھی دیا جائے گا۔ مضمون کی نوعیت کا تقاضا ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں شائع ہو۔

[1] اس دور کی ابتدا ترکی اتصال سے شروع ہوئی جب ترکی خلافت ختم ہو گئی اور پرانا پروگرام بھی بیکار ہو گیا۔

اساسی اصول ہمارے نزدیک حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مولانا شیخ الہند نے امام ولی اللہ کی حکمت پڑھانا ضروری قرار دیا۔ اس سے ہم ایک خاص نتیجہ نکالتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ کی فلاسفی کو ہم اپنی مستقل پارٹی کا اساسی اصول بناتے ہیں۔ امام ولی اللہ کی فلاسفی غیر مسلم ہندوستانی کو بھی اپنے ساتھ لے سکتی ہے۔ نیز یہ یورپین ازم کی لادینیت کو فنا کر سکتی ہے۔ پھر اس فلاسفی نے اقتصادیات کے متعلق جو اصول سمجھائے ہیں، اس کی بنا پر یہ تمام دنیا پر تفوق حاصل کر سکتی ہے۔

(۲) مولانا شیخ الہند نے علی گڑھ کالج کے انقلابی عنصر کو اپنی تحریک میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے پارٹی پروگرام چلانے والے ایک طرف مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد تھے، تو ان کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی مساوی درجہ پر شریک تھے۔ مولانا شیخ الہند کے اس اقدام سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہم "یورپین ازم" کو اپنی پارٹی کے مستقل پروگرام میں داخل کرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا انگریزی پڑھا طبقہ، جسے ہم کالج پارٹی کا نام دیتے ہیں، آگے چل کر لا محالہ ترکوں کے کمالی پروگرام کو قبول کرے گا۔ چونکہ ترکی میں کمالی پروگرام کے ساتھ لادینیت بھی آگئی ہے اور لادینیت کے معاملے میں ہم سکوت نہیں کر سکتے، اس لیے اس کو روکنے کے لیے ہم امام ولی اللہ کی فلاسفی کو اپنے پروگرام کا ضروری اساس بناتے ہیں۔

(۳) مولانا شیخ الہند انڈین نیشنل کانگرس میں شریک ہو گئے تھے۔ اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ عدم تشدّد کی پالیسی سے ڈومینین اسٹیٹس حاصل کیا جائے۔ ہماری پارٹی کے پروگرام کا یہ تیسرا اصول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عدم تشدّد کی پابندی کا لازمی نتیجہ صرف ڈومینین اسٹیٹس ہی ہو سکتا ہے۔

حزب ولی اللہ کے تیسرے دور کے لیے ہم جو پروگرام تجویز کرتے ہیں، ہمارے نزدیک اس کے یہی تین اصول ہیں۔ جس طرح پہلے دور کے خاتمہ پر اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد اسمٰعیل شہید اور ان کے رفقاء کے کارناموں سے ولی اللہی تحریک کو زندگی بخشی، ہم امید کرتے ہیں کہ دوسرے

دور میں مولانا شیخ الہند اور ان کے مشائخ نے جو خدمات سر انجام دی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو قبول فرمائے گا۔ ان کے عزائم میں اس قدر برکت نازل کرے گا کہ امام ولی اللہ کی تحریک اپنے اس تیسرے دور میں ہندوستان کی اصلاح کرکے اُسے اس منزل پر پہنچا دے گی کہ وُہ دنیا کی رہنمائی کا ذریعہ بن سکے۔ اللہ ہی ہے۔ جو اس میں کارسازی فرمائے۔

حزب ولی اللہ کے تیسرے دَور کے اس پروگرام کی وضاحت کے سلسلے میں چند باتیں اور لکھنا ضروری ہیں۔ ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ جمعہ کی شب (۱۷۳۱ء) کو امام ولی اللہ نے ایک الہامی خواب دیکھا تھا، جس میں آپ کو یقین دلایا گیا تھا کہ گردوپیش کے مفاسد کی اصلاح کے لیے ان کو ایک مستقل ذمہ دار حیثیت دی جائے گی۔ نیز نظام سلطنت اتنا بوسیدہ اور بیکار ہو چکا ہے کہ اسے توڑ دیا جائے گا۔ اور اس کی جگہ نیا نظام قائم کرنے کا وُہ ذریعہ بنیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے تمام دینی علوم اور سیاسی واجتماعی تحریکات میں امام ولی اللہ مستقل امام ہوں گے۔ تفہیمات ج ۲ ص ۱۲۱، ۱۲۲ میں ایک اشارہ ہے کہ آپ کو اس الہام کی تکمیل کے لیے انبیاء کی طرح صبر کرنا چاہیئے۔ امام ولی اللہ نے اپنے فکر سے سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ کو متعارف کیا اور تعلیم وارشاد کے لیئے ایک جماعت تیار کر لی۔ ان کے بعد شاہ عبدالعزیز نے نظامِ حکومت چلانے کے لیے آدمی بھی تیار کر دیئے۔ جنہوں نے ۱۸۲۶ء میں اپنی مُوقتہ حکومت بنائی۔ لیکن بالاکوٹ کے حادثہ میں اس حکومت کو شکست ہوئی اور امیر شہید اور اُن کے ساتھی شہادت پا گئے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وُہ یہ کہ وُہ شکست کیوں کھا گئے؟ ہم اپنی پرانی ذہنیت میں اس شُبے سے بہت متاثر رہے اور کبھی رد کر اور کبھی کسی کو دو چار جلی کٹی سنا کر اس دور میں ہم اپنا جی ٹھنڈا کر لیتے تھے۔ مگر اثنائے سیاحت میں جب ہمیں یورپ کی انقلابی تحریکوں کے مطالعہ کا موقع ملا تو ہم نے دیکھا کہ ایک اعلیٰ انقلاب کی منزل تک پہنچنے میں متعدد بار شکست کھانا چنداں بعید نہیں ہے۔ کیا خود اسلام کی ابتدائی تاریخ میں باہمی خانہ جنگیاں نہیں ہوئیں۔ یہ چیز اصل میں انقلابی تحریک کے لوازم میں سے ہے۔ اس کے بعد ہم مطمئن ہو گئے کہ اگر شاہ صاحب کی تحریک

ایک بار شکست کھا گئی تو یہ حقیقت میں تحریک کی مکمل شکست نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم نے اپنے دیوبندی اساتذہ کے کام کو شاہ صاحب کی تحریک کا دوسرا دَور قرار دیا، اس دوسرے دَور کو ہم مولانا شیخ الہند کی وفات پر ختم کرتے ہیں۔ اس دَور میں بھی اس تحریک کو شکست ہوئی۔ مگر وُہ اپنے نتیجے میں تیسرے دور کے لیے مبادی تیار کر گئی ہے اور میں اسی امید پر زندہ ہوں۔ مجھے اس تحریک کی آخری کامیابی میں کسی قسم کا شبہ و تردد دامن گیر نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اشتراکی تحریک کو دیکھیے۔ سوشلسٹ انقلابی تحریک سب سے پہلے فرانسیسی انقلاب کے موقع پر شروع ہوئی اور اسے شکست ہوئی۔ پھر دوسری بار منظم ہوئی اور شکست کھا گئی۔ بعد ازاں روس میں لینن نے اس کو تیسری بار منظم کیا اور اس کا نام اسی مناسبت سے تھرڈ انٹرنیشنل تجویز ہوا۔ کارل مارکس کے اصل نظام اور لینن کے موجودہ نظام نامہ میں کافی فرق ہے۔ مگر وہی تحریک اپنے تیسرے دَور میں کامیاب ہو کر رہی اور زمین کے ایک بڑے قطعے پر اپنی حکومت قائم کر سکی۔

ہماری تحریک کے اس تیسرے دَور میں میرے نزدیک حزب ولی اللہ کی سیاست میں مصطفےٰ کمال کا قومی انقلاب ایک جزو ہوگا۔ اور شاہ ولی اللہ کا عقلی اور اقتصادی فلسفہ اس پر حکومت کرے گا۔ نیز عدم تشدد کی پابندی سے انڈین نیشنل کانگرس کے اندر رہ کر حکومت بنانے کے لائق آدمی تیار کرنا ضروری ہوں گے۔ میں ان اصولوں پر ایک نئی پارٹی مولانا شیخ الہند کی یادگار میں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ہر سہ اصول حضرت شیخ الہند کے تلقین کردہ ہیں۔

(۱) شاہ ولی اللہ کے فلسفے کو وُہ دیوبند کے درجۂ تکمیل میں داخل کر چکے ہیں۔

(۲) ان کے زمانے میں ترکی کی نقل علی گڑھ کالج میں موجود تھی اور مولانا شیخ الہند کالج کی تحریک کو اپنے اندر ہضم کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کے آگے کام کرنے والوں میں اگر ایک طرف مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد تھے، تو دوسری طرف ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی بھی تھے۔ بے شک علی گڑھ کالج اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو مصطفےٰ کمال کی نقل کرے گا۔ ہم اس ترقی یافتہ

علی گڑھ کو اپنے اندر لینا چاہتے ہیں۔ دیوبندی جماعت کا جو آدمی یہ حوصلہ نہیں رکھتا، اس کو سیاسیات سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے۔ اور اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے کسی کام کو وہ شیخ الہند کی طرف منسوب کرے۔

وَتِلْکَ شَرَائِعُ لِلشَّیخِ قِدمًا   وَقَد نُسِخَت بِشَیخِ الہِندِ حَالًا

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے شاہ صاحب نے اساسی اصول مقرر کیے ہیں اس سلسلے میں ہمیں بتایا ہے کہ کسی نظام کی جگہ دوسرا نظام لانے کے لیے ایک عرصہ تک تیاری کرنا پڑتی ہے۔ اور اس کے لیے کارکنوں کی تربیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مدت میں عدم تشدد کی پابندی لازمی ہے۔ ان اصولوں کی اتباع اور ان کے نہج پر تیاری کے لیے انڈین نیشنل کانگرس میں ہمیں وسیع میدان ملتا ہے۔ اس کے مدنظر ہم کانگرس میں نئی پارٹی بنانا چاہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہماری قوم پرانے اصول حکمت بھول چکی ہے۔ اب وہ یورپین طریقے کے نظام حکومت کو سیکھ کر ہی کامیاب ہو سکے گی۔ افغانستان، ترکی عربی ممالک یقیناً سب کے سب یورپین طریقے پر اپنی حکومتوں کی تجدید کر رہے ہیں۔ ہم یہاں شاہ جہاں کی حکومت کا اعادہ نہیں کر سکتے۔ بے شک روح وہی رہے گی۔ مگر حکومت کی صورت یقیناً یورپین ہو گی۔ ہمیں اس وقت ڈومینین اسٹیٹس قبول کرنا چاہیئے۔ اس سے ہمیں یورپ کی ایک بڑی حکومت کا تعاون حاصل ہو گا ہم موجودہ حالات میں بہت سی مصلحتوں کو ملحوظ رکھ کر برٹش کامن ویلتھ میں رہنا منظور کرتے ہیں

مگر کانگرس کے عام طرفدار ان چیزوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ یورپ میں جس طرح انقلاب ہوا، اس قسم کے انقلابات کی وہ یہاں توقعات باندھے بیٹھے ہیں۔ لیکن ہمارا ملک یورپ سے بہت سے بنیادی امور میں مختلف ہے۔ یورپ میں عمومی تعلیم، پریس کی ترقی اور فوجی خدمت کے لزوم نے انقلاب کے لیے میدان صاف کر دیا تھا۔ ہمارے عوام علم سے بے بہرہ اور فوجی ڈسپلن سے ہزاروں کوس دور ہیں۔ لہٰذا وہ یورپ کے طریقے پر انقلاب کو کبھی نہیں سنبھال سکتے۔

اس طرح کے انقلاب کا ابھی اسی زمانے میں دو بار تجربہ ہو چکا ہے۔ پہلا تجربہ روس میں ہوا۔

روس میں عمومی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ تاہم انقلاب کے داعیوں نے طے کر لیا کہ وہ اس کو کامیاب بنا کر دکھا دیں گے، مگر وہ اس میں سو فیصدی ناکام ہوئے۔ شکست کے بعد انہوں نے عوام کی تعلیم کو اساس قرار دے کر جبر اور ڈکٹیٹر شپ سے کام لیا۔ اس طرح ایک حصہ ملک کو تیار کیا اور اس کے مناسب انقلابی نظام بھی تبدیل کر دیا۔ تب کہیں جا کر وہ حکومت چلا سکے۔ جو لوگ کارل مارکس کے پکّے متبع ہیں، وہ لینن کے کام کو کبھی تعریف کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ لینن نے بہت سی ایسی تبدیلیاں منظور کر لی تھیں جو اس کے ملک کے لیے ضروری تھیں۔ روس کے انقلاب کو ہندوستان میں بیٹھ کر پڑھنے والے ایسے امور سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔

دوسری بار انقلاب ترکی میں ہوا۔ روسی عوام میں تو فی الجملہ ابتدائی تعلیم تھی۔ لیکن ترکی اس سے بالکل بے بہرہ تھا۔ مصطفیٰ کمال مجبور تھا کہ عربی زبان اور عربی رسم الخط کو قطعی طور پر ترک کر کے اپنے اہل ملک کو ان کی مادری زبان رومن حروف میں سکھائے۔ چنانچہ وہ اپنی ڈکٹیٹر شپ کے زور سے بہت جلد ایک پارٹی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن ہمارا ملک روس اور ترکی ہر دو سے پیچھے ہے۔ بے شک ہمارے ہاں ایک مختصر سا متوسّط طبقہ پیدا ہو چکا ہے، جو یورپ کے تمام علوم کو جانتا ہے۔ وہی کانگرس کو چلا رہا ہے اور وہی انقلاب کی توقعات باندھے ہوئے ہے۔ مگر انقلاب عوام کی مشارکت کے بغیر کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور یہ لوگ ہیں کہ ہندوستانی عوام کے نزدیک جانا بھی پسند نہیں کرتے۔

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی ان تمام چیزوں کو سمجھتے ہیں، مگر وہ گجرات سے باہر ہندوستان کے کسی ٹکڑے میں اپنی طرز کی حکومت نہیں بنا سکتے۔ گاندھی جی ادنیٰ طبقہ کی خدمت اور تربیت کے واسطے متوسط طبقے کو (جو انکو لیڈر مانتا ہے) متوجہ کر سکتے ہیں۔ ہم اس کی پوری قدر کرتے ہیں، مگر یہ انقلاب کے مبادی میں معمولی درجہ کی چیز ہے۔ انسانیت کے مفادِ عامہ کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرنا انقلاب کی اصل اساس ہے۔ یہ چیز گاندھی جی کی اپنی شخصیت میں علیٰ وجہ الکمال موجود ہے۔ لیکن ان کے معتقدوں میں شاید فیصدی ایک میں ہو۔ اس لیے ہم گاندھی پارٹی کے مصنوعی

شور و شغب سے متاثر نہیں ہوتے۔

ہم اپنے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق انسانیت کی اصلاح کے لیے قربانی کا جذبہ نہایت آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں۔ قرآنِ عظیم کا یہ مقصد معین کرنے میں امام ولی اللہؒ ہماری نظر میں منفرد ہے۔ اس لئے ہم ان کے سوا کسی کی تفسیر کو قبول نہیں کر سکتے۔

ہم جس طرح اپنے نوجوانوں کو قرآنِ عظیم کی تعلیم کی مدد سے اس مقصدِ عالی کی طرف لے آتے ہیں، اسی طرح اگر ہندو تعلیم یافتہ نوجوان ہم پر اعتماد کرے تو ہم اس کو ولی اللہؒ فلاسفی پڑھا کر بھگوت گیتا کی تعلیم کے ذریعہ اسی مقصد پر لے آئیں گے۔ یہی طرح ہمارا بائیبل ماننے والی اقوام ساتھ رہے گا۔ ہم ولی اللہ فلاسفی پر بائیبل پڑھا کر ان کو بھی انسانیتِ عامہ کے مفاد پہ جمع کر دیں گے۔

الغرض مولانا شیخ الہندؒ ہمیں تین چیزیں بتا گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ نے درجۂ تکمیل میں شاہ ولی اللہ کا فلسفہ اور مولانا محمد قاسمؒ کی حکمت داخل کرائی۔ دوم سیاسی تحریک میں دیوبندی جماعت کے ساتھ علی گڑھ پارٹی کو مساوی درجہ پر شامل کرنا منظور کر لیا۔ سوم یہ کہ انڈین نیشنل کانگرس کے اندر جا کر بیرونی ممالک اسلامیہ کی سیاسیات سے علیحدگی اختیار کر کے کام کرنے کی راہ سمجھا۔

ہمارے اس مقولہ کا "پہلے یورپین بنو" اصل مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے اندر جنگی طاقت اور حربی قوّت پیدا کریں۔ شاہ ولی اللہؒ اپنی کتاب "خیر کثیر" صفحہ ۱۱۲ میں لکھتے ہیں کہ حکومت چلانے کی استعداد مسلمانانِ ہند سے افغانوں کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیزؒ نے ایک خواب[1] بھی دیکھا تھا، جس میں امیر المومنین حضرت علیؓ نے انہیں پشتونوں کی طرف توجہ کرنے کی تلقین فرمائی تھی۔ دراصل اس سے مُراد فقط جنگی طاقت اور حربی قوّت ہے۔ افغانوں میں چونکہ لڑنا اور مردانگی موجود ہے، اس لیے ان کو ایک عالم منظم کر کے اسلامی حکومت کی فوج بنا سکتا تھا۔ مگر جس قوم سے لڑتے مرنے کی طاقت سلب کر لی گئی ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ آج اس کی مثال ہندو بنیے سے ملتی ہے۔ وہ

---

[1] تفصیل ملاحظہ ہو ضمیمہ

بڑا حساب داں ہے۔ بڑا مالدار ہے مگر وہ حکومت نہیں سنبھال سکتا ہے۔ اور ایک معمولی سپاہی اس کی جائداد پر قبضہ کر کے مالک بن سکتا ہے۔

اگر ہندوستانی قومیں انگریزی فوج میں ملازمت کر کے یورپین طریقہ پر سپاہی بننا سیکھیں گی تو ان کے لیے ہندوستان کی آئندہ حکومت کو سنبھالنا ممکن ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں باوجود ہزار ہا اختلافات کے سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب کی ہمیشہ تائید کرتا ہوں کہ وہ میری قوم کو فوج میں بھیجنے کا حامی ہے۔ سو میں نوّے افراد جنگ میں مر سکتے ہیں، مگر دس جو واپس آئیں گے، وہ ہمارا اصلی سرمایہ ہوگا۔ اس لیے ہم تعلیم یافتہ طبقہ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ یورپین طریقے پر فنون حرب سیکھیں۔ مستقبل میں جب ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس مل جائے گا تو اس وقت وہ اپنے کاشتکاروں کو فوجی تعلیم دے سکیں گے، اس کے لیے کاشتکاروں کو بھی یورپین بنانا پڑے گا۔ اگر قومی زندگی میں کاشتکاروں کی اہمیت کا انکار کیا گیا تو ان کا وجود ہی بیکار ہو جائے گا۔ اس لیے ہم اپنی قوم سے وہ لعنت کے جراثیم جو مسجدوں اور خانقاہوں سے پھیلتے ہیں اور قوم کو نامردی سکھانے کا نام انہوں نے اسلام رکھا ہوا ہے، مذکورہ وقت آنے سے پہلے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

ہم عام لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبانیں انگریزی حروف میں لکھنا پڑھنا شروع کر دیں اپنے خاندان کے کسی فرد کو وہ عورت ہو یا مرد، ایسا نہ چھوڑیں کہ وہ اپنی زبان یورپین حروف میں نہ لکھ سکتا ہو۔ اس کے بعد اس کو ترکوں کی طرح زندگی بسر کرنا سکھانا چاہیئے۔ ترکوں میں بھی اسی طرح بے ایمان لوگ موجود ہیں، جیسے ہمارے یہاں ہیں۔ مگر ترکی قوم کے ایمان میں مجموعی طور پر جسے شبہ ہو سکتا ہے، وہ احمق ہے۔ اب ترکوں نے اپنا قومی طریقہ "یورپین ازم" بنا لیا ہے۔ ہم اس مسلم قوم کے ترقی یافتہ نمونے پر اپنی قوم کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان حقائق سے ہمارے بڑے بڑے عالم ناواقف ہیں۔ اس وقت ان کو واقف کرانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کو نہایت نرم زبان میں یہ باتیں سمجھا دی جائیں گی مگر ہماری قوم میں ایک ضدی عنصر بھی موجود ہے۔ وہ مسلمانوں کی ہر تباہی کو قبول کر سکتا ہے۔

مگر اپنے پرانے طرز میں کسی تبدیلی کا روادار نہیں ہو سکتا۔ ہم انہیں منہ نہیں لگاتے اور جب موقع ملے گا ہم انہیں ختم کر دیں گے۔ یہ کہہ کر میں صرف اپنی ذہنیت کی ترجمانی نہیں کر رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں انقلاب آئے گا۔ میں اصل میں اس انقلابی جماعت کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ میں نے روس میں اور ترکی میں انقلابی جماعتوں کا کافی تجربہ کیا ہے۔ وہ سب کے سب ایک ہی مسلک پر چل رہے ہیں۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں۔ ان کے مذاہب مختلف ہیں مگر معاشرت کا طریقہ سب میں مشترک ہے۔

ہمارے ہاں کے سمجھ دار طبقے کو ہماری طرح جب تک کہ ہم ہندوستان میں تھے، یہاں ایک شبہ دامن گیر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انگریزی کالجوں اور انگریزی دفاتر سے ہمارا نوجوان سوائے یورپین فیشن کے اور کچھ نہیں سیکھتا۔ اس سمجھ دار طبقے نے دیکھا ہے کہ یہ نوجوان ملازمت سے روپیہ کماتا ہے اور اپنی ضرورتیں اس قدر بڑھاتا ہے کہ باپ دادا کا اندوختہ اس فیشن پرستی کی نذر کر کے ختم کر دیتا ہے۔ پھر نزاکت، بزدلی اور نامردی کا پورا پورا نمونہ بن جاتا ہے۔ اور دن رات اس رٹ میں لگا رہتا ہے کہ یورپین بنے بغیر انسان انسان نہیں کہلا سکتا۔ ہمیں خود اس گروہ سے اپنی زندگی میں کافی واسطہ پڑتا رہا ہے۔ ہم اپنی پرانی ہندوستانی زندگی میں اس سے متنفر رہے اور اپنی قوم کو اس یورپ زدگی سے بچانے کے لیے کوشش کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔

اب ہماری ذہنیت یہ بن چکی ہے کہ ہم ان نازک اندام افراد کے بجائے اپنے کاشتکاروں کو یورپین بنائیں۔ ہمارا "یورپین ازم" کا پہلا تجربہ غلط اور غیر مفید ثابت ہوا۔ ہم اپنی قوم کے کارکن عنصر کو جو ہمارے ملکوں میں زیادہ تر کاشتکار رہے، اقتصادی مصیبتوں میں گرفتار دیکھتے ہیں۔ اسے ان مصائب سے نجات دلانا قوم کی ہستی کے لئے ضروری ہے اور اس کی نجات کا اور کوئی ذریعہ نہیں سوائے اس کے یہ عنصر اپنی اصلاح کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ مگر اس اصلاح کے لیے اسے تعلیم دینا ضروری ہے۔ سرمایہ دار حکومت نے تعلیم قوم کے چند افراد کے لئے مخصوص کر رکھی ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے کاشتکاروں کو کالج کے گریجوایٹ بنا سکیں۔ مگر یورپ کے طریقے پر کاشتکاروں

کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن سب سے پہلے انہیں اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہیئے اس کے لیے ہمارا عربی رسم الخط ایک قوی مانع ہے۔ ایک ایسے انسان کو جو چوبیس گھنٹے کام میں مصروف رہتا ہے، یہ خط سکھانا جو ایک ایک حرف کی کئی شکلیں پیش کرتا ہے، سیکھنے اور سکھانے والے دونوں کے لیے بے حد دشوار ہے۔ اس کے برعکس رومن حروف جو علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں، ان کی ایک دفعہ حرف شناسی ہو جائے تو پھر ساری عمر کے لئے انسان فارغ ہو جاتا ہے۔ ہم ٹائپ رائٹر مشین کے ذریعہ اپنے بچوں کو چند گھنٹوں میں اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سکھا سکتے ہیں۔ سپاہی بننے کے لئے اتنی ہی تعلیم ضروری ہے۔ اس تعلیم پر وہ مصارف بھی عائد نہیں ہوتے جو کالج میں گریجوایٹ بننے پر آتے ہیں اور نہ انسان فیشن پرستی کا شکار ہو کر نزاکت اور بزدلی کا نشانہ بن سکتا ہے۔

جس وقت ہم اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تو ہر زبان کے لیے ایک مرکزی پریس تعلیم دینے کے لیے کافی ہے۔ اس سے ماہوار رسالے نکلیں گے۔ ہفتہ وار پرچے ہوں گے۔ روزنامے ہوں گے۔ اور ہر شخص اپنی زبان میں گھر بیٹھے پڑھ سکے گا۔ قوموں کو اس طرح تعلیم دینے کی سہولت، جس طرح اس عہد میں موجود ہے۔ پہلے زمانے میں کسی کے خیال میں بھی نہیں تھی۔ اس لئے اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

مذکورہ بالا بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میرا اپنا ذاتی دوسرا پروگرام بھی ہے۔ میں کم از کم قرآنِ عظیم کی چالیس سورتوں کی تفسیر کر کے اس کو قوم کی مادری زبان میں پریس کے ذریعے ان کے گھروں میں پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد ان کو کوئی دجّال دین سے بھٹکا نہ سکے گا، سوائے ان لوگوں کے جو دجالیت پر مطبوع ہوئے ہوں۔ میری زندگی کا آخری مقصد یہی آخری چیز ہے۔ مگر یہ اس پہلی تعلیم پر موقوف ہے۔ اسی لئے میں اس پر زور دیتا ہوں۔ اب اس سے بہتر کوئی اور پروگرام ہو تو میرے مخاطب اسے میرے سامنے لائیں، میں اس کو مان لوں گا۔

مسلم لیگ کے اراکین کی اسکیمیں جو ساری عمر انگریزی دفتروں میں کام کرتے رہے یا کسی عالم

کی تجاویز جو سلف کے طریقے کا تو ماہر ہے مگر اس یورپ کا ایک حرف نہیں جانتا۔ جس نے تمام اسلامی سلطنتوں کو ہضم کر لیا ہے۔ الغرض ان لوگوں کی اسکیمیں اور تجاویز جو خالد بن ولید اور فاروق اعظم کا نام لے کر پیش کی جاتی ہیں، میں نہیں سننا چاہتا۔ فاروق اعظم کو سمجھنے کے لیے کم از کم شاہ ولی اللہ کی حکمت کا سمجھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی ان کی حکمت کا ایک صفحہ غور سے پڑھے گا تو وہ یورپ کو سب سے پہلے دیکھے گا۔ یہ سلف کا نام لینے والے بیچارے عموماً حقیقت سے بے خبر ہیں۔

ضمیمہ جات

لہ آصف جاہ اوّل

موجودہ نظام حیدر آباد کے جدِ امجد ہیں۔ وُہ سلطان عالمگیر کے دربار کے پروردہ اور سربر آوردہ تھے۔ عالمگیر سلطنت ختم ہو گئی، مگر آصف جاہ کی اولاد اب تک حکمران ہے۔ آصف جاہ نے دہلی کی سلطنت کو تقویت دینے کے لیے اسکیم تیار کی تھی۔ وُہ اپنی عقل اور دانش کو دربار محمد شاہ کی تقویت کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے لیکن وُہ اس میں ناکام رہے۔ اس پر انہوں نے اپنی عقل کو خود اپنی شخصی ترقی اور ترفع کے لیے لگا دیا، جس میں وُہ کامیاب ہوئے۔ محمد شاہ ابتدا میں ان کا طرفدار تھا مگر بد اندیش درباریوں نے بادشاہ کو آصف جاہ سے بدظن کر دیا۔ بعد ازاں ان کو خود اپنے لیے جو کچھ کرنا تھا کیا۔ گو پہلے وُہ اپنی تمام قوتیں دربار کے لیے صرف کرنا چاہتے تھے۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی مقدمۂ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۱ میں لکھتے ہیں ”شاہ عبدالرحیم کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے کتب خانہ میں میری نظر سے گزرا۔ اس

میں آپ کا ایک خط نظام الملک آصف جاہ اوّل کے نام ہے جس میں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کرنے کی ترغیب دی ہے۔" آصف جاہ کے حالات اور اس کے کارناموں کے لیے سیر المتاخرین اور تاریخ ہند از ذکاء اللہ جلد نہم دیکھیے۔ آپ کا سن وفات سنہ ۱۱۶۱ھ ہے۔

؎۲ مرزا مظہر جانجاناں

آپ کا پورا نام شمس الدین حبیب اللہ ہے۔ موصوف علوی سادات کے بلند مرتبہ خانوادے سے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد کا شمار امرائے شاہی میں سے ہوتا تھا اور تیموری سلاطین سے بھی آپ کی قرابت تھی۔ آپ ہر فن اور تمام علوم ظاہری میں بہرہ کامل رکھتے تھے۔ چہار شنبہ ۷ محرم الحرام سنہ ۱۱۹۵ھ کا واقعہ ہے کہ رات کا ایک حصہ گزر چکا تھا کہ آپ کی خانقاہ پر چند لوگوں نے دستک دی خادم نے عرض کیا کہ کچھ لوگ زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انہیں آنے دو۔ چنانچہ تین آدمی اندر آئے۔ ان میں سے ایک مغل زادہ تھا، جس نے چھوٹتے ہی آپ پر حملہ کیا اور دل کے قریب کاری زخم لگایا۔ اس کے بعد تین روز تک آپ زندہ رہے اور جمعہ کی شام کو جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ (خزینۃ الاصفیاء)

مولانا سندھی کے غیر مطبوعہ مسودہ کتاب "التمہید" میں ہے "امام ربانی کے طریقہ مجددیہ کے اکابر میں سے ایک امام شمس الدین حبیب اللہ مظہر جانجاناں ہیں۔ آپ شاہ ولی اللہ کے ہم عصر تھے۔ شیخ محسن اپنی کتاب "یانع جنی" میں امام ربانی کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ ان کے بعد آنے والے ان کے جلیل القدر اصحاب میں سے ایک بزرگ شمس الدین المظہر معروف بہ جانجاناں شہید دہلوی ہیں۔ آپ حضرت علیؓ کے صاحبزادہ محمد بن الحنفیہ کی اولاد میں سے تھے۔ موصوف بے شمار فضیلتوں کے حامل تھے۔ آپ نے الحاج محمد افضل سیالکوٹیؒ سے حدیث پڑھی تھی اور مجددی طریقہ امام ربانی کے بڑے عالی مرتبت پیروؤں سے حاصل کیا تھا۔ اتباعِ سنت اور کشفی قوت میں آپ کا بلند مقام تھا۔ موصوف کے استاد شیخ سیالکوٹیؒ، امام ولی اللہ اور الحاج فاخر الہ آبادی ایسے ائمہ تصوف اور محدثین نے آپ کے علم و فضل اور جلالتِ شان کی شہادت دی ہے۔ مشہور محدث محمد حیات

سندھی ثم مدنی کا قول ہے کہ اگر کوئی حدیث فقہ حنفی کے معمول کے خلاف وارد ہو اور مرزا جانجاناں اس حدیث کی توثیق کریں تو اس کے باوجود بھی اس حدیث پر عمل کر لینا چاہیئے۔ آپ نے عاشورۂ محرم میں شہادت پائی۔ آپ کی شہادت کی تاریخ "عاش حمیداً و مات شہیداً"، مشہور حدیث سے نکالی گئی ہے۔ مرزا جانجاناں کے جلیل القدر اصحاب میں سے قاضی ثناء اللہ الوی ثم عثمانی ہیں آپ پانی پت کے رہنے والے تھے اور بہت بڑے فقیہہ، اصولی، زاہد اور مجتہد تھے۔ آپ نے حنفی فقہ میں بعض مسائل کا خود استخراج فرمایا تھا۔ فقہ، تفسیر اور زہد کے مسائل پر آپ کی بعض مشہور تصنیفات بھی ہیں۔ موصوف کے استاد مرزا جانجاناں آپ پر فخر کیا کرتے تھے۔

"التمہید" میں ہے کہ مرزا جانجاناں مظہر اور امام ولی اللہ آپس میں دو بھائیوں کی طرح تھے جو ایک دوسرے سے راضی ہوں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ سرزمین دہلی اب تک ان دو بزرگوں پہ نازاں ہے۔ امام مظہر جانجاناں نے دہلی کے کسی شیعہ امیر کے نوکر کے ہاتھ سے ۱۱۹۵ھ میں شہادت پائی۔

آپ کا ایک شعر ہے:۔

بہ لوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

امیر الروایات میں ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے قتل میں نجف علی خاں حاکم دہلی کا ہاتھ تھا۔ جو مذہباً رافضی تھا۔ (بحوالہ شیخ محسن صفحہ ۲۷۷)

۳۔ مجتہدانہ کمال

تجدید انقلاب کے لیے حدیث و فقہ میں "مجتہدانہ کمال"، ضروری امر ہے۔ اجتہاد کے متعلق شاہ ولی اللہ "مصفیٰ"، میں لکھتے ہیں "ہر زمانے میں اجتہاد فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں اجتہاد سے مقصود اجتہاد مستقل نہیں جیسا کہ امام شافعی کا اجتہاد تھا۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہر زمانہ میں اجتہاد فرض ہے، اس کا دراصل مطلب یہ ہے کہ چونکہ مسائل آئے دن نئے سے نئے پیدا ہوتے رہتے

ہیں۔ ان کے بارے میں احکام الٰہی کا جاننا ضروری ہے اور جو کچھ پہلے مدّون اور مرتب ہو چکا ہے وُہ کافی نہیں ہوتا۔ پھر اس میں بھی بہت اختلاف ہوتا ہے۔ یہ اختلافات اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے، جب تک دلائل کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔ اور مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان دلائل کا سلسلہ اصل مجتہدین تک جایا نہیں جاسکتا۔ ان حالات میں اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہیں ہوتی کہ مسائل کو اجتہاد کے اصولوں پر پرکھا جائے۔"

جب تک کوئی انسان اپنے فکر پر مستقل اعتماد نہ رکھتا ہو، وُہ کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔ استقرارِ فکر کے تین درجے ہیں۔ اوّل شرعیات میں خلافتِ راشدہ کو امام بنانا ضروری ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو اس سے بھی مستثنیٰ کرے اور قرآنِ حکیم کو اپنے مستقل فکر سے حل کرنا چاہیے، اُسے ہم مجتہدین میں شمار نہیں کرتے۔ وُہ دراصل اپنی موروثی ذہنیت کو قرآن کا لباس پہنا دیتا ہے۔ خلافتِ راشدہ کا اِتباع کرنے والا ایک حکیم اگر اپنا مستقل فکر رکھتا ہے۔ اس کے فکر میں اور خلافتِ راشدہ میں کوئی اور واسطہ نہیں۔ اور وُہ خلافتِ راشدہ کے دستور العمل کو پڑھ کر اپنے فکر سے تطبیق دے لیتا ہے تو یہ ہے مجتہد مطلق مستقل۔ اس کی مثال ائمہ ثلاثہ ہیں۔ امام احمد کو ہم امام شافعی کے اتباع میں شمار کرتے ہیں۔ اگر امام شافعی کے مذہب کے ساتھ امام احمد کا مذہب ملا کر مدون کر دیا جائے تو یہ ایک بڑی چیز ثابت ہوگا، جیسے صاحبین کا مذہب امام ابو حنیفہ کے مذہب سے مل کر بہت بڑی چیز بن گیا ہے اور اس نے چار دانگِ عالم کو مسخر کر رکھا ہے۔

"ہمارے نزدیک امام احمد کے مذہب کی حیثیت امام شافعی کے مذہب کے تتمہ کی سی ہے اس بارے میں شاہ ولی اللہ اپنی کتاب "الانصاف" میں فرماتے ہیں "امام احمد کا مذہب امام شافعی کے مذہب کے ساتھ اسی طرح متعلق ہے، جس طرح امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب ابو حنیفہ کے ساتھ۔ البتہ جس طرح ان دونوں صاحبوں کا مذہب امام ابو حنیفہ کے مذہب کے ساتھ مدون کیا گیا ہے، اسی طرح امام احمد کا مذہب امام شافعی کے ساتھ جمع نہیں کیا گیا۔ اس لیے ان دونوں کا شمار الگ الگ کیا جانے لگا۔ اب بھی اگر کوئی کوشش کرے تو ان دونوں مذہبوں کو باہم

مدوّن کرنا زیادہ مشکل نہیں ۔" (التمہید)

ہم توقع رکھتے ہیں کہ حنبلی مذہب کے فقہا امام شافعی کے مذہب میں تبحر حاصل کریں گے اسی طرح شافعی مذہب کے فقہا حنبلی مذہب کے متبحر ہوں گے۔ اور اسی طرح اگر حنفی مذہب والے اور مالکی مذہب والے بھی دونوں آپس میں ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں تو امتِ اسلامیہ کے لئے اس میں بڑا فائدہ ہوگا۔

استقرارِ فکر کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ایک مجتہد مستقل کو استاد مان کر یہ فن اس سے سیکھ لیا جائے۔ مگر استاد کی طرح اس عالم کا اعتماد بھی براہِ راست خلافتِ راشدہ پر ہو، جیسے صاحبین۔ ایسے ائمہ کو مجتہد منتسب کہا جاتا ہے۔ یہ دوسرا درجہ ہے۔ اجتہاد کا اور انقلاب کے لئے کم از کم اس درجہ کا مجتہد ہونا ضروری ہے۔

استقرارِ فکر کا ایک تیسرا درجہ تجویز کیا گیا ہے، جسے مجتہد فی المذہب کہتے ہیں اس کا تعلق خلافتِ راشدہ سے نہیں ہوتا۔ مجتہد مستقل اور اس کے اتباع میں جتنے مجتہد منتسب پیدا ہوئے، ان کے اختلافات کو یہ ایک اصول کے اندر حل کر دیتا ہے۔ اس لئے ایک مذہب کی کتابیں پڑھانے میں یہ استاد کامل ہوتا ہے۔ نیز یہ شخص حکومتِ اسلامی کے داخلی انتظام کے لیے قاضی و مفتی بننے کے لیے بہت کار آمد ہے۔ یہی نظامِ داخلی کو مستحکم بنا دیتا ہے، جیسے حنفیہ میں شمس الائمہ سرخسی وغیرہ ائمہ حنفی فقہ میں جس قدر مجتہد گزرے ان کی نظیر نہیں ملتی۔ خراسان کے ایک ایک گاؤں میں دس دس مجتہد فی المذہب گزرے ہیں اور مذہب حنفی کی بقا اور استحکام کی یہ وجہ بھی ہے۔ سلطنتیں مٹ گئیں مگر عوام میں مذہبِ حنفی موجود و محفوظ ہے اور اس کی مخالفت ترک اسلام کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔

۱۲ شاہ صاحب کا الہامی خواب

اصل خواب "فیوض الحرمین" صفحہ ۸۹ میں مذکور ہے۔ استبدادی حکومتوں کا خاصہ ہے کہ حکمراں کے ماسوا کوئی شخص سیاسیات پر رائے زنی نہیں کر سکتا۔ اس لئے حکمائے اسلام کا ایک طبقہ جو شعر و شاعری

کا مذاق رکھتا ہے، اپنی منظوم تصانیف میں قصص وحکایات یا مدح ونصائح کی صورت میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔ جنہیں اس طرح اظہار خیالات کا موقع نہیں ملتا، ان کے افکار صادقہ کا سلسلہ واقعاتِ مستقبلہ کی صورت اختیار کر کے خواب میں نظر آتا ہے۔ اُن کے معتقد اس بشارت کو سنتے ہیں۔ اس کی تعبیر میں غور کرتے ہیں اور حقیقتِ واقعہ عریاں ہو کر نظر آنے لگتی ہے۔

شاہ صاحب نے اپنا انقلابی نظریہ حجاز میں مکمل کر لیا تھا۔ جسے آپ نے "فیوض الحرمین" میں ایک خواب کی شکل میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ شب جمعہ ۲۱ ذیقعدہ سنہ ۱۱۴۴ھ کو میں نے مکۂ معظمہ میں خواب دیکھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس زمانے کا نظام قائم رکھنے میں ایک واسطہ بنایا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کفار کا سردار مسلمانوں کے شہروں پر غالب آگیا ہے۔ اس نے ان کے اموال لوٹ لیے اور انہیں قید کر لیا۔ اجمیر جیسے شہر میں کفر کے خصوصی احکام جاری کر دیئے اور اسلامی قانون کے خاص کام ممنوع قرار دیئے۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے متاثر ہو کر میں غضب سے بھر گیا اور میرے غضب کا اثر اس ہجوم میں بھی پھیل گیا، جو میرے گرد جمع ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی رضا کس طرح ہو سکتی ہے۔ میں نے جواباً کہا "فَکُّ کُلِّ نظام" یعنی تمام بوسیدہ نظاموں کو توڑ دو۔ اس کے بعد وہ ہجوم آپس میں جنگ شروع کر دیتا ہے۔ پھر میں ایک شہر کے قریب پہنچا تاکہ اس کو برباد کر دوں۔ اُدھر وہ لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آئے اور لگاتار شہروں کو برباد کرتے ہوئے اجمیر پہنچ گئے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے کفار کے سردار کو ذبح کر ڈالا اور اس کی رگہائے گردن سے خون بڑے زور سے بہہ رہا ہے۔

اس خواب کی تعبیر میں غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کی شکست کی طرف اشارہ ہے۔ اور شاہ ولی اللہ ایک طرح پر اس کے سرانجام دینے کا واسطہ ہیں۔

اجمیر کا ذکر اس لیے آتا ہے کہ دہلی کا روحانی مرکز اجمیر تھا۔ خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ، اجمیر میں تشریف لائے اور یہیں سے اشاعتِ اسلام کا کام شروع کیا جس کے نتیجہ میں دہلی فتح ہوئی۔ اس خواب کے دو سال بعد سنہ ۱۱۴۶ھ میں باجی راؤ شمالی ہند پر حملہ آور ہوا۔ اُدھر سنہ ۱۱۵۰ھ میں

نادر شاہ کی یلغار سے تمام سابقہ انتظامات کمزور ہونا شروع ہوئے۔ نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اس سلسلے کو جاری رکھا جس میں مسلمانوں کی خانہ جنگی اور ان کے نظامِ سلطنت کی بوسیدگی ظاہر کرنے کے ماسوا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ مگر اسی احمد شاہ نے ۱۹ ذیقعدہ سنہ ۱۱۷۴ھ میں پانی پت پر مرہٹوں کا خاتمہ کر دیا۔

ہندوستان کے جن مسلمان امیروں نے احمد شاہ کو اس حملہ کی دعوت دی تھی، ان میں نواب نجیب الدولہ پیش پیش تھے۔ یہ تاریخی حقیقت سب کو معلوم ہے کہ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص مسترشدین میں تھے۔

اس واقعہ کے قاعدے "فکِّ کُلِّ نظام" کو شاہ ولی اللہ نے اپنے انقلابی نظریے کا عنوان قرار دیا اور تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف کی تمام کتابوں میں جو پچاس کے قریب ہیں، مناسب مواقع پر اجتماع کے فساد کی تفصیل اور انقلاب کی ضرورت پر کافی بسط سے بحث کی ہے۔

۵ شاہ صاحب کی مستقل امامت

شاہ ولی اللہ کے اصول کو چھوڑ کر کوئی شخص اسلام کی علمی طاقت کو محفوظ رکھنا چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ نیز ان کے سیاسی اصول ترک کر کے حکومت بنانا چاہے گا تو یقیناً ناکام رہے گا۔ "تفہیمات الٰہیہ" صفحہ ۸۱ میں ہے کہ "مجھے تقرب الی اللہ کا ایک نیا طریقہ عطا کیا گیا ہے جس سے تمام پرانے طریقے منسوخ ہو گئے ہیں۔ لوگوں کو پرانے طریقوں سے محبت ہے، جس سے ان کو ایک قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے مگر تقرب الی اللہ ان طریقوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔"

یہاں پر اس قدر تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ امام ولی اللہ اپنے طریقے میں خدا یاد کرنے کے اشغال اور حکومت بنانے کے قوانین، ہر دو چیزوں کو ایک مرتبہ پر جمع کر دیتے ہیں۔ انہوں نے حکومت کا نام خلافتِ ظاہرہ رکھا ہے اور حکومت پیدا کرنے والی جماعت کا نام خلافتِ باطنہ تجویز کیا ہے۔ آج کی اصطلاح میں اگر اس کا ترجمہ کیا جائے تو پہلے درجے کو گورنمنٹ کہا جائے گا۔ اور دوسرے درجے کو وہ پولیٹیکل پارٹی جو اس گورنمنٹ کو پیدا کرتی ہے۔

یہ دونوں چیزیں سیاست میں آگے پیچھے نہیں کی جاسکتیں بلکہ مساوی عزت کی مستحق ہیں شاہ صاحب ان کے لیے وہ خصوصی سیاسی لفظ جو اسلام میں مستعمل تھا یعنی "خلافت" استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کے دو حصے بنا کر دونوں جماعتوں کو ایک نقطے پر جمع کرنا چاہتے ہیں ان کی پولیٹیکل پارٹی کے لیے ذکر و فکر ضروری ہے ورنہ وہ دینی حکومت کبھی پیدا نہیں کر سکے گی۔

وہ جس وقت "اپنا طریقہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس میں ان کی ساری تحریک علمی ہو یا اخلاقی، وجدانی ہو یا سیاسی، سب کی سب یکساں داخل ہے۔

اس تنبیہ کے بعد ہمارا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شاہ صاحب کے خلاف ذکر و فکر کا کوئی طریقہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح شاہ صاحب کے اصول کو چھوڑ کر کوئی سیاسی تحریک دینی حکومت پیدا کرلے میں کامیاب نہ ہوگی۔ شاہ صاحب کے مذکورہ ذیل جملوں کا مطلب ہم یہی سمجھتے ہیں کہ طریقت و اشغال اور مذہب و سیاست سب چیزیں ان ہی کے اتباع میں تقرب الی اللہ کا باعث بن سکتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"اس مذہب کے بعد تو کوئی ایسا مذہب نہیں دیکھے گا اور اس کے طریقۂ سلوک کے ماسوا تجھے کوئی طریقہ نظر نہ آئے گا جو "جذب" کی اصل روح پر مشتمل ہو۔ بے شک بہت سے اہلِ طرق اور اصحابِ مذاہب ضرور ہیں جو اپنے اپنے طریق اور مذہب کے پابند ہیں۔ نیز جن سلوک کی راہوں پر وہ گامزن ہیں، وہ ایک حد تک مفید اور کارآمد بھی ہیں۔ لیکن "جذب" کی صحیح روح اُن کے ہاں مفقود ہے۔ یہ ہے وہ روز قیامت جس سلسلے میں کہ اس "وصی" کو مبعوث کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور اس کے عالمِ وجود میں آنے کے لیے یہ شرط کی گئی تھی" صفحہ ۸۱/۱ تفہیمات

الغرض یہ تصریحات بظاہر طریقت کے لئے لکھی گئی ہیں، مگر ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہؒ سیاسی اصول میں بھی دنیا بھر کے امام ہیں۔ ہندوستان تو ایک طرف رہا، یورپ میں بھی ان کے اصول سے ہٹ کر کوئی حکومت نہیں رہ سکتی۔ ہم اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھوا سکتے ہیں، مگر ہمارے ملک کی فضا اس کے موافق نہیں ہے۔

۶۔ مدرسہ شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد کی وفات کے بعد "مدرسہ رحیمیہ" میں، جس کی بنیاد شاہ عبدالرحیم ڈال گئے تھے، طلبہ کو درس دینا شروع کیا۔ بارھویں صدی کے آغاز اور گیارہویں کے اختتام پر شاہ عبدالرحیم نے پرانی دہلی میں اس مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا، جو اب مہندیوں کے نام سے مشہور ہے اور اس کا نام مدرسہ رحیمیہ رکھا۔ (حیات ولی صفحہ ۲۲۔)

شاہ ولی اللہ صاحب کے علمی کمال کا شہرہ بڑھا اور طلبہ اطراف واکناف سے آنے لگے تو مدرسہ رحیمیہ ان کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ سلطان محمد شاہ نے امام ولی اللہ کو بلا کر شہر میں ایک عالیشان مکان دے کر دارالحدیث کا اس میں افتتاح کرایا۔ اس کے بعد قدیم جگہ غیر آباد ہو گئی یہ نیا مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالیشان اور خوبصورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ شورش ۱۸۵۷ء تک اپنی اصلی حالت پر قائم رہا۔ اگر اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا کہ اس شورش میں مکانات لوٹ لیے گئے، کڑی تختے تک لوگ اٹھا کر لے گئے تو آج بھی شاید وہ باقی رہتا۔ اس کی وسعت اور کشادگی کا یہ عالم تھا کہ اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں، مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے مشہور ہے اور آج تک پکارا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد ان کے چاروں صاحبزادوں نے وہی مشغلۂ درس وتدریس جاری رکھا اور اس مدرسہ نے تعلیم دینیات میں وہ نام پیدا کیا کہ ہندوستان میں شہرہ ہو گیا، جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق مہاجر مکیؒ نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ اس مدرسہ کی مسجد کا حال شاہ عبدالعزیز صاحب اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

"در آں ہنگام بزرگاں بسیار و اولیاء بسیار از یاراں والد معتکف مسجد بودند" (ملفوظات شاہ عبدالعزیز صفحہ ۱۰۹)۔ جب مولانا محمد اسحاق نے سنہ ۱۲۵۶ھ میں ہجرت کی تو مولانا مخصوص اللہ اور مولانا موسیٰ خلف مولانا رفیع الدین اس کی نگرانی فرمانے لگے۔ ان حضرات کے انتقال کے بعد

مولانا موسیٰ صاحب کے ایک صاحبزادے میاں عبد السلام بہت صغیر سن رہے اور ایک صاحبزادی رہ گئیں۔ خاندان بھر میں کوئی ایسا نہ تھا، جو عبد السلام صاحب کو پڑھاتا لکھاتا۔ غرض یہ سلسلہ جو کئی پشت سے اس خاندان میں جاری تھا بند ہوگیا۔ اب چونکہ یہ کل جائداد رائے بہادر لالہ شیو پرشاد کی ہے، اس لیے اس گلی پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے (التقاط از کتاب "دار الحکومت دہلی" ص ۲۸۹/۲ و ص ۱۶۷/۱ از مولوی بشیر الدین صاحب)

۳ مولانا محمد عاشق پھلتی

(مولانا سندھی اپنی کتاب "التمہید" (حصہ اردو) میں فرماتے ہیں۔ عام طور پر صدہا اہل علم شاہ ولی اللہ صاحب سے مستفید ہوئے۔ حرمین شریفین سے باmذاق عالم ان سے علم سیکھنے کے لیے دہلی آتے رہے۔ لیکن ان کے مکمل نظریے کو سمجھنے والے تین چار رفقاء سے زیادہ نہیں ہیں (۱) ان کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق (۲) جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللہی کشمیری (۳) شاہ نور اللہ بڈھانوی (۴) شاہ ابو سعید بریلوی۔ پہلے تین حضرات شاہ عبد العزیز کے استاد ہیں۔ چوتھے شاہ ابو سعید خلیفہ شاہ ولی اللہ اور جد مادری حضرت سید احمد شہید۔ امیر شہید حضرت شاہ ابو سعید کے نواسے تھے) (صفحہ ۲۳)

امام ولی اللہ "تفہیمات الٰہیہ" (ص ۱۲۵/۱ و ص ۱۲۶/۱) میں لکھتے ہیں "شیخ محمد عاشق شیخ عبید اللہ کے صاحبزادہ ہیں۔ اور شیخ عبید اللہ کے والد شیخ محمد قدس سرہ، میرے نانا تھے۔ بچپن ہی سے شیخ محمد عاشق کو مجھ سے محبت تھی۔ میرے والد شاہ عبد الرحیم میرے ساتھ شیخ محمد عاشق کو اللہ کی خوشنودی کی راہ میں اس طرح باہم دگر دوست پاکر خوش ہوتے اور فرماتے کہ آگے چل کر اس دوستی سے بڑا کام سرانجام ہوگا۔ شیخ عاشق کو مجھ سے طریق حق طلب کرنے کی خدا نے توفیق دی۔ ان کا ظاہر و باطن، دل و جسم اور زبان میری محبت میں رنگے گئے اور وہ ہمہ تن مجھ سے اخذ علم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ موصوف اس راہ میں برابر آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی روح پورے طور پر بیدار ہوگئی۔ اور میں نے دیکھا کہ انہیں کامل درک اور مکمل احاطۂ علم ہوگیا ہے۔

چنانچہ مجھے اس طرف سے پورا یقین ہے کہ نہ اُن کے حالات کبھی پلٹا کھائیں گے اور نہ ان کے اقوال میں تذبذب پیدا ہوگا۔ میں نے دیکھا ہے کہ میرے اور ان کے درمیان جو دروازہ تھا، وہ اس طرح کھل گیا ہے کہ جو کچھ وہ مجھ سے اخذ کرتے ہیں، اس میں مطلق تقلید کا رنگ نہیں ہوتا۔ یوں سمجھے گویا کہ میں اور وہ دونوں ایک ہی سرچشمہ سے اخذ علم کرتے ہیں۔

شیخ عاشق کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کے اطوار سب پسندیدہ اور مرغوب ہیں۔ وہ بحمد اللہ میرے خیر خواہ ہیں، میرے علم کے راز داں ہیں۔ میرے اسرار کے محافظ ہیں، اور میری کتابوں کے نگراں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کتابوں کو صفحۂ قرطاس پر لانے کے وہ سبب اور باعث بنے۔ اور انہوں نے ان کتابوں کے مسودوں کو صاف بھی کیا۔ میرا خیال ہے کہ میرے علوم ان کی وجہ سے ہی لوگوں میں باقی رہیں گے۔ مجھے یہ الہام ہوا ہے کہ لوگوں میں ان کا ذکرِ خیر عام کر دوں۔ اور ان کی سربستہ صلاحیتوں کو پردۂ راز میں نہ رہنے دوں۔ میں نے ان کو اپنا خرقۂ تصوف پہنا دیا ہے، جیسا کہ میرے والد بزرگوار نے مجھے اپنا خرقہ پہنا دیا تھا اور جیسا کہ ان کے علاوہ ابوطاہر مدنی نے اپنے خرقہ سے مجھے سرفراز فرمایا تھا۔ حضرت ابوطاہر کا خرقہ تمام اولیاء کے خرقوں پر جامع تھا۔ میں نے شیخ محمد عاشق کو اجازت دی ہے کہ وہ دوسروں کو تصوف کے ان اشغال کی تلقین کریں، جو انہوں نے مجھ سے سنے ہوں۔ اس کے علاوہ ان اشغال کی بھی جو مجھ سے نہ سنے ہوں۔ نیز وہ راہِ سلوک کے طالبوں کو جو اُن کے مرید ہوں، جیسے ان کی مرضی ہو، چلائیں اور ہر طبقے سے "فتوح" قبول کریں۔ نیز حدیث، تفسیر اور باقی دینی علوم جو انہوں نے مجھ سے پڑھے ہیں، یا جو ہم دونوں حرمین کے مشائخ سے ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ دوسروں کو پڑھائیں"

"انفاس العارفین"، میں شیخ محمد عاشق کے متعلق امام ولی اللہ کا ارشاد ہے۔ فرماتے ہیں۔

"والد بزرگوار نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک دفعہ اس فقیر اور شیخ محمد عاشق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں باہم دگر دوستی رکھتے ہیں اور ان کی اس دوستی سے مجھے بڑی خوشی اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس ارشاد کی حقیقت مجھ پر بعد میں ظاہر ہوئی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اس عزیز

کو فقیر کے ساتھ ربطِ طریقت پیدا ہو گیا اور موصوف میرے متبع بن گئے۔ مجھے امید ہے کہ یہ دوستی بے شمار فوائد کا باعث ثابت ہو گی۔"

شاہ عبدالعزیز "عجالۂ نافعہ" میں لکھتے ہیں۔ "والد ماجد کے بعد میں نے ان کے عالی مرتبت ساتھیوں مثلاً محمد عاشق اور خواجہ محمد امین ولی اللہی سے علم حاصل کیا۔ شیخ محمد عاشق نے والد ماجد کے ساتھ شیخ ابوطاہر اور حرمین کے دوسرے مشائخ سے اخذِ علم کیا تھا" (صفحہ ١٠٢)

شیخ محسن "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں "شیخ ولی اللہ کے جلیل القدر اصحاب میں سے ایک شیخ محمد عاشق ہیں۔ موصوف حجاز میں شاہ صاحب کے شریک سبق بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں سے علم سلوک پر ایک مشہور کتاب ہے۔ اس کے بعد شیخ محمد امین کشمیری ہیں، جو اصل میں بخارا کے تھے اور دہلی میں بس گئے تھے۔ آپ اپنے استاد کی طرف منسوب ہوتے تھے اور اسی نسبت سے مشہور عام و خاص تھے۔ ان دونوں بزرگوں سے شاہ عبدالعزیز نے پڑھا جیسا کہ وہ اپنی کتاب "عجالۂ نافعہ" میں بیان کرتے ہیں (صفحہ ٩٤)۔

رہے مولانا نور اللہ بڈھانوی۔ آپ امام ولی اللہ کے تلامذہ میں سے تھے۔ تفہیمات جلد اول صفحہ اول پر شاہ صاحب نے ان کو جو اجازت نامہ لکھ کر دیا ہے۔ مفصل موجود ہے۔ فقہ حنفی میں شاہ عبدالعزیز کے استاد تھے اور آپ شاہ عبدالعزیز کے خسر بھی تھے۔ ان کے بیٹے مولانا ہبۃ اللہ ہیں، جن کے صاحبزادے مولانا عبدالحی ہیں۔ مولانا عبدالحی شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ میں ان کے بھائیوں کے بعد سب سے بڑے آدمی ہیں۔ "انفاس العارفین" میں جو شاہ عبدالرحیم کے حالات پر مشتمل ہے مولانا نور اللہ کے جستہ جستہ حالات " موجود ہیں۔

۵ مدرسہ نجیب آباد

احمد شاہ ابدالی کو دعوت دینے میں نواب نجیب اللہ خاں اور نواب حافظ الملک رحمت خاں والیِ بریلی وغیرہ اُمرا شریک تھے۔ حافظ الملک کی سرکار سے سینکڑوں طلبہ کو ماہوار امداد ملتی تھی، جو شاہ صاحب کے مدرسہ میں تعلیم پاتے تھے۔ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص مسترشدین میں سے

تھے۔ شاہ صاحب ہی کے مشورے سے انہوں نے اور ان کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو قندھار سے بلایا۔ احمد شاہ کے بلانے میں وہ ایک واسطہ ثابت ہوئے۔ لیکن دراصل شاہ صاحب کی روحانیت کام کر رہی تھی۔ اس جنگ میں افواج ابدالی کے ساتھ نواب شجاع الدولہ وزیر اور نواب نجیب الدولہ کی افواج سرگرم کار رہیں اور بڑے اعلیٰ کارنامے دکھلائے، ابدالی کی جنگ میں نواب نجیب الدولہ مقدمۃ الجیش کے افسر تھے۔ سیر المتاخرین میں ہے "بعد از حصولِ این فتح ۱۱۷۴ھ احمد شاہ ابدالی از میدانِ جنگ (پانی پت) خرامیدہ در سوادِ دہلی نزول فرمودہ و چند روز توقف نمودہ سلطنت برائے شاہ عالم و وزارت بنام شجاع الدولہ و امیر الامرائی بنام نجیب الدولہ مقرر نمودہ بہر دو سفارش ہم دگر نمودہ۔ نجیب الدولہ را مامور بہ بودن شاہجہان آباد کرد۔ ۱۶ شعبان ۱۱۷۴ھ زباغ شالامار دہلی بقصد قندھار بکران ہمت زیر آں کشید" (صفحہ ۹۱۵)

نواب نجیب الدولہ نے ایک مدرسہ قائم کیا تاکہ شاہ ولی اللہ کے طریقے کی تعلیم ہو۔ نواب مذکور کی عظمت و جلالت اور علم دوستی کا اندازہ شاہ عبدالعزیز کے ارشاد ذیل سے کیا جا سکتا ہے "نزد نجیب الدولہ نہ صد ۹۰۰ عالم بود، ادنیٰ پنج روپیہ اعلیٰ پنج صد روپیہ می یافت" (ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۸۱)

نواب نجیب الدولہ ایسا عاقل اور ہوشیار تھا کہ کمتر ہوتے ہیں۔ امانت اور ایمانداری تو اس وقت اس پر ختم تھی۔ وہ اپنے پرانے آقاؤں نواب دوندے خاں روہیلہ اور نواب وزیر شجاع الدولہ کی فرمانبرداری کیے جاتا تھا۔ اس وقت بھی یہ جوانمرد اس ٹوٹی پھوٹی سلطنت کو نبھا رہا تھا (تاریخ ہند از ذکاء اللہ ص ۳۱۶)

۹ دائرہ شاہ علم اللہ

سید شاہ علم اللہ عہد عالمگیر کے مشہور عالم ربّانی اور صاحب سلسلہ شیخ تھے۔ آپ شیخ آدم بنوری کے بڑے خلفاء میں سے تھے۔ اس طرح سے آپ اور حضرت مجدّد کے درمیان صرف حضرت شیخ بنوری کا واسطہ تھا۔ سرتاپا اتباعِ سنت کا نمونہ تھے۔ شاہ غلام علی صاحب نقشبندی دہلوی

کے دار المعارف میں ہے کہ آپ کے انتقال کی رات عالمگیر نے خواب میں دیکھا کہ آج رات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ بادشاہ کو اس خواب سے بہت تشویش ہوئی۔ علماء سے تعبیر دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ تاریخ لکھ لینی چاہیے۔ اس رات کو سید علم اللہ صاحب کی وفات ہوئی ہو گی۔ کیونکہ وہی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں۔ سرکاری وقائع نگار کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ اسی شب کو سید صاحب نے انتقال فرمایا۔

سید احمد امیر شہید کی ولادت اسی دائرے میں، جو اب تکیہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہے، صفر ۱۲۰۱ھ میں اپنے والد سید محمد عرفان کے گھر ہوئی۔

۱۰۔ شیخ معین الدین ٹھٹوی

الشیخ معین الدین ٹھٹوی عرف مخدوم ٹھارو (بضمہ مجہولہ) مخدوم محمد ہاشم اور ان کے صاحبزادے عبد اللہ کے استاد ہیں۔ شیخ عبد الحق دہلوی کے طریقہ کے خلاف شاہ ولی اللہ کے طریقے کو ترجیح دینے کے لیے آپ نے "دراسات اللبیب" لکھی۔ اس کتاب کا "الدراسۃ الثانیۃ عشر" خصوصی طور پر مطالعہ کرنا چاہیے، جس میں انہوں نے امام بخاری کی تاریخ صغیر کی اس عبارت کا رد لکھا ہے، جہاں انہوں نے امام ابو حنیفہ پر جرح کی ہے۔ کتاب مذکور لاہور میں طبع ہو چکی ہے۔ اہل حدیث ہی نے طبع کرائی، اس کا رد شیخ عبد اللہ مذکور نے لکھا جس میں شیخ عبد الحق کے طریقے کی ترجیح ہے۔ کتاب کا نام "ذب الذبابات عن الدراسات" ہے۔ دار الرشاد سندھ میں اس کا ایک نسخہ خطیہ موجود ہے۔ پورا تذکرہ شاہ معین الدین کا تحفۃ الکرام اور تاریخ سندھ میں موجود ہے۔ کتاب مطبوعہ ہے۔ کراچی مدرسہ مظہر العلوم میں کتاب موجود ہے۔ ومن شعرہ ؎

سگت را خون دل دادم کہ با من آشنا گردد
ندانستم ز بخت بد کہ او دیوانہ خواہد شد

۱۱۔ شاہ عبد اللطیف بھٹائی

شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی کتاب "الرسالہ"، مطبوعہ سندھی زبان میں وہی درجہ رکھتا ہے۔ جو فارسی

میں مثنوی مولانا روم کا ہے۔ اس کو ہندو اور مسلمان سب مساوی طور پر پڑھتے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔

شاہ محمد معین مصنف "دراسات اللبیب" اور شاہ عبداللطیف ہم مسلک بزرگ ہیں۔ اور وحدۃ الوجود کے دونوں یکساں عارف ہیں۔ شاہ محمد معین جب فوت ہونے لگے تو آپ نے وصیّت فرمائی کہ میرا جنازہ تیار کر کے مسجد میں رکھ دیا جائے اور عبداللطیف کا انتظار کیا جائے۔ شاہ عبداللطیف صحرانورد تھے۔ کیا معلوم کہ وُہ کس صحرا میں ہوں۔ ان کو کس طرح اطلاع ملے اور کب آئیں؟ مگر جنازہ تیار ہونے کے تھوڑی دیر بعد آپ تشریف لے آئے اور امامت کرائی۔ بعدہٗ کہا کہ آج کے بعد تھٹہ سے ہمارا تعلق منقطع ہو گیا ہے۔

کپتان الیگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ شہر تھٹہ (سندھ) میں مختلف علوم و فنون کے چار سو کالج تھے۔ علامہ مقریزی جو ہندوستان کی سیاحت کے لیے تشریف لائے، اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ محمد شاہ تغلق کے عہد میں صرف دلی شہر میں ایک ہزار مدارس تھے۔ پروفیسر ماکس ملر سرکاری کاغذات کی بناء پر لکھتا ہے کہ برطانوی حکومت سے قبل بنگال میں ۸۰ ہزار دیسی مدارس تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ آبادی کے ہر چالیس افراد کے لیے ایک مدرسہ قائم تھا۔ ریورنٹ وارڈ نے سنہ ۱۸۲۱ء میں بیان کیا تھا کہ انڈیا ڈسٹرکٹ سکولوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں ہر اکتیس لڑکے پر ایک سکول ہے۔ (التقاط از شیخ محسن)

۲۱۔ معرکہ پانی پت

امام ولی اللہ نے سنہ ۱۱۴۴ھ میں جو خواب دیکھا تھا، اس کے دو حصے تھے۔ حصہ اوّل کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں "میں نے دیکھا کہ بادشاہِ کفار مسلمانوں کے شہروں پر قابض ہو گیا ہے۔" اس خواب کا مشاہدہ آپ کو یوں کرایا گیا کہ لال قلعہ پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا۔

سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ ذی الحجہ کی انیسویں تاریخ کو لال قلعہ پر بدمست بھاؤ کا قبضہ ہو گیا اور حرم سرائے شاہی اور سلطنت کے سارے کارخانے بھی مرہٹوں کے تسلط میں آ گئے۔" ذالک تقدیر العزیز العلیم"

شاہ صاحب لکھتے ہیں: "میں نے دیکھا کہ بادشاہ کفار مسلمانوں کے مال و دولت کو لوٹ رہا ہے۔" اس حصہ خواب کی تعبیر یہ ہے کہ جس وقت لال قلعہ پر مرہٹوں نے قبضہ کیا، تو انہوں نے بڑی لوٹ کھسوٹ کی۔ اس کا اندازہ سیر المتاخرین کی اس عبارت سے کیجیے: "بھاؤ کی دناءت اور تنگ چشمی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے دیوانِ خاص کی چھت کو جس پر کہ چاندی کی مینا کاری تھی اکھڑوا کر پگھلا لیا اور قدم نبوی، مقبرہ نظام الدین اولیاء، اور مرقد محمد شاہ پر جو سونے اور چاندی کے جھاڑ، ظروف، شمع دان اور قندیلیں رکھی ہوئی تھیں، ان کو لوٹا اور سب کو پگھلا کر سونے اور چاندی میں بدل لیا۔"

بھاؤ کی مذکورہ ذیل دناءت بھی قابل توجہ ہے۔ میر غلام علی "خزانۂ عامرہ" کے صفحہ ۴۸ میں لکھتے ہیں: "بالاجی راؤ باوجود اس کے کہ وہ ہندوستان اور دکن کی سلطنت کا مالک بن چکا تھا، باجرہ کی روٹی کھاتا تھا اور اسے گندم کی روٹی اچھی نہ لگتی تھی۔ وہ کچے بینگن، کچے آم اور کچے کرسنہ بڑے شوق سے کھاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ برہمنوں کا اصل پیشہ چونکہ گداگری ہے اور ہندوؤں کے ہاں یہ دستور ہو چکا ہے کہ وہ برہمنوں کو صدقے دیتے ہیں۔ اس لیے اس قوم کی نسل ہا نسل سے دریوزہ گری عادت سی ہو گئی ہے۔ چنانچہ طماعی اور غرض کا بندہ ہونا برہمنیت کا خاصہ بن چکا ہے اور یہی سبب تھا کہ بالاجی راؤ سلطنت و امارت کی مسند پر بیٹھنے کے باوجود کیش گدائی کے چکر سے نہ نکل سکا تھا، اس زمانہ میں یہ حالت تھی کہ اگر کوئی غرض مند اپنی ضرورت کے لیے برہمن حکام یا متصدیوں کے پاس جاتا تو ان میں سے ہر ایک کی نظر اس بات پر ہوتی کہ وہ ان کے لیے کیا لایا ہے

بدستِ خلق عالم کاسہ دریوزہ می بینم

گدا چوں بادشاہ گردد گدا سازد جہانے را

ان میں سے خواہ کوئی غنی ہوتا یا فقیر، ارہر کی دال پر اس کی غذا کا دار و مدار تھا۔ وہ دال بگھارتے تک بھی نہ تھے۔ نہ وہ اس میں اوپر سے گھی ڈالتے، تاکہ اس طرح ہی دال کی خشکی دور ہو جاتی۔ وہ سرخ مرچ، ہینگ اور ہلدی ہر کھانے میں ڈالتے اور بڑی کثرت سے ان چیزوں کا استعمال کرتے۔ کھانا پکاتے وقت مرچ ڈالی جاتی۔ اس کے علاوہ جب سالن کے ساتھ روٹی کھاتے تو کچی مرچ بھی ساتھ کھاتے جاتے۔"

شاہ صاحب اپنا خواب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "بادشاہِ کفار نے خاص اجمیر کے شہر میں کفر کے شعائر جاری کر دیئے۔ اس نے شعائرِ اسلام کو باطل قرار دیا" دہلی جس کا روحانی مرکز اجمیر ہے خواجہ معین الدین چشتی نے وہیں سے اشاعت و تبلیغ کا کام شروع کیا تھا جس کے نتیجہ میں دہلی فتح ہوئی۔ اسی دہلی میں ملک الکفار کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس نے یہاں شعائرِ کفر کا اعلان کر دیا اور شعائرِ اسلام کو ختم کر دیا۔ سیر المتاخرین کا مصنف لکھتا ہے کہ بھاؤ نے شاہجہاں آباد کی قلعہ داری نارو شنکر برہمن کے سپرد کی اور ایک جماعت کو قلعہ کی حراست کے لیے اس کے ہمراہ بھیجا۔

الغرض امام ولی اللہ نے جیسے جیسے خواب میں دیکھا تھا، انہیں خصوصیات کے ساتھ ملک الکفار مسلمانانِ ہند پر غالب آیا اور ان کے مرکزِ سیاسی پر اس نے قبضہ کر لیا۔

اسی خواب کا دوسرا حصہ معرکۂ پانی پت سے متعلق ہے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ احمد شاہ ابدالی نے یکایک ہندوستان پر حملہ کر کے مرہٹہ تحریک کو پانی پت کے میدان میں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا، سیر المتاخرین میں لکھا ہے "افواجِ دکن مع بھاؤ، وسواس راؤ اور دوسرے سرداروں سمیت اس معرکہ میں کام آئیں اور مرہٹوں کی سلطنت اس طرح بیخ و بنیاد سے اکھڑی کہ ہندوستان (مراد شمالی ہند سے ہے) میں ان کی جماعت کا اثر تک نہ رہا۔ اس کے بعد تمام قلمرو ہندوستان میں مرہٹوں کا ایک نفر بھی دیکھنے میں نہ آتا تھا۔" دراصل اس کا سبب خوابِ مذکورہ بالا کا یہ ٹکڑا ہے،

جس میں شاہ صاحب فرماتے ہیں "میں نے خواب میں اپنے آپ کو یوں دیکھا، جیسا کہ میں "قائم الزمان" ہوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو اس کو سرانجام دینے کے لیے وہ مجھے "جارحہ" یعنی ذریعہ بناتا ہے"۔

شاہ صاحب کے "جارحہ" ہونے کی یہ صورت ہوئی کہ سب سے پہلے بھاؤ نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے نواب شجاع الدولہ والئ اودھ سے سازباز شروع کی، اس سلسلے میں اس نے اپنا ایک برہمن سفیر اس کے پاس بھیجا۔ اس کے جواب میں شجاع الدولہ نے کہا۔ "ایک مدت سے دکن کے برہمن ہندوستان پر مسلط ہو گئے ہیں۔ ان سے خدا کی خلق کو نہ آسائش پہنچی اور نہ وہ لوگوں کی آبرو کے روادار ہیں، ان کی ساری جدوجہد محض اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ ان کے ہاتھوں خلقت تنگ آ چکی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے پاسِ ناموس کی خاطر اور اپنی آبرو بچانے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو بڑی منت وسماجت کے بعد ولایت سے بلوا بھیجا ہے انہوں نے شاہ ابدالی کے حملے کے صدموں کو مرہٹوں کی ایذا سے آسان اور کم تکلیف دہ سمجھا ہے۔ اس کے بعد سیر المتاخرین کا مصنف نواب نجیب الدولہ وغیرہ اُمرائے ہند کے متعلق لکھتا ہے۔ نواب نجیب الدولہ اور دوسرے امراء مرہٹوں کی وجہ سے پریشان تھے اور عماد الملک تو مرہٹوں کے ہاتھوں خود اپنی آنکھوں سے سلطنت کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ ان سب نے احمد شاہ ابدالی کو عریضے لکھے اور اسے ہندوستان آنے کا بلاوا بھیجا۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ کے خواب میں مذکور ہے۔ دونوں فریق آپس میں لڑنے لگے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ ان مسلمانوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو آپس میں لڑ رہے ہیں۔ میں نے یہ سنا اور اس کا جواب نہ دیا۔ معرکۂ پانی پت کے سلسلے میں تاریخ ہند اس امر پر شاہد ہے کہ مرہٹوں کی اس جنگ میں مسلمانوں کی ایک جماعت ان کی فوج میں بھرتی ہو کر میدان جنگ میں لڑی۔ اس میں عرب اور ہندوستانی فوج کے علاوہ توپ خانہ کا سردار ابراہیم گاردی بھی تھا۔ اس نے عین معرکۂ جنگ میں ہمت کر کے توپوں کی زنجیر بندی

کی اور مرہٹوں کو کچھ دیر تک بچاتے رکھا۔ سیر المتاخرین میں ہے "۶ جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ بروز چہار شنبہ بھاؤ نے پانی پت کے میدان میں اپنی صفیں جمائیں اور ابراہیم خان کو فرنگی توپ خانہ دے کر آگے کیا۔ ایک طرف مرہٹے "ہر ہر" کے نعرے لگاتے ابدالی لشکر کی طرف بڑھے اور دوسری طرف ابراہیم نے بڑے زور و شور سے توپوں سے گولہ باری کی۔ بھاؤ نے اپنے خاص رسالہ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں اور ابدالی کے لشکر پر جھپٹ پڑے۔"

اس کے بعد خواب کا اگلا حصّہ یہ ہے۔ "میں نے دیکھا کہ لوگوں نے ملک الکفار پر دھاوا کر کے اس کو ذبح کر دیا ہے۔ جب میں نے خون اس کی رگوں میں بہتے دیکھا تو میں نے کہا۔ ..... الخ" تاریخ ہند مصنفہ سیّد ہاشمی میں مذکور ہے کہ بھاؤ نے دلّی پر قبضہ کرنے کے بعد ارادہ کیا کہ اپنے بھتیجے بسواس راؤ پسر بالاجی راؤ کو تختِ دہلی پر بٹھا کر یہ اعلان کر دے کہ اب ہندوستان کے تخت و نگیں کے مالک مرہٹہ برہمن ہیں۔ مگر جنگ پانی پت کے خاتمہ تک اس نے اس اعلان کو ملتوی کرنا مناسب سمجھا۔ مگر جنگ میں بسواس راؤ امیدوار تخت و تاج اور تخت بخش بھاؤ ہر دو کام آئے۔ سیر المتاخرین کا مصنف اس واقعہ کے متعلق لکھتا ہے۔ "بڑے بڑے سرداروں میں سے شہزادہ بسواس راؤ پسر بالاجی راؤ جس کا ابھی عین شباب تھا، گولے کا نشانہ بنا۔ اس کے بعد مرہٹوں کا سپہ سالار بھاؤ جو بالاجی راؤ کا چچازاد بھائی تھا، ہلاک ہوا۔ غنیم کے بڑے سرداروں میں سے سوائے دو تین سو نفر کے کوئی بچ کر نہ جا سکا۔ اس شکستِ فاش کے صدمے سے بالاجی راؤ بھی دل شکستہ ہو گیا اور دوسری دنیا کو سدھارا۔ وہ اپنے بیٹے اور بھائی کے بعد کل ۵ ماہ ۷ روز جیا۔ ابراہیم خاں گاردی میدان جنگ میں اسیر ہوا اور اس کا سر تلوار سے اڑا دیا گیا۔ یہ ہے تعبیر خواب کے اس جملہ کی کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے کاموں کے لیے "جارحہ" بنایا، اور یہی معنی اس ارشاد کے ہیں کہ "میرے دل میں ذاتِ اقدس کی طرف سے نہ کہ اس عالم کی جہت سے یہ باتیں ملہم کی گئی ہیں۔"

بعد ازاں شاہ صاحب نے خواب میں دیکھا تھا "ہم اجمیر تک پہنچے۔" بعینہٖ اسی طرح ابدالی مع افواج قاہرہ کے شہروں کو فتح کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ اسی "جارحہ" کا تقاضا تھا کہ شاہ

ابدالی فتح کے بعد حکومتِ دہلی حق داروں کے حوالے کر کے خود سیدھا قندھار روانہ ہو گیا اور یہاں حکومت کرنے کا خیال تک اس کو نہ آیا۔

۱۳۔ خروج مہدی کا عقیدہ

امام ولی اللہؒ "ازالۃ الخفا" میں لکھتے ہیں "اب سوال ابن ماجہ کی مشہور حدیث کا ہے۔ اس حدیث کا اشارہ ابومسلم کے خراسان سے نکلنے کی طرف ہے۔ اور اسی خلیفہ کو مہدی کہا گیا ہے، اور اسی کی نصرت کی ترغیب دی گئی ہے۔ ابن ماجہ کی حدیث یہ ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ بنی ہاشم کے چند نوجوان لڑکے آپؐ کی طرف آئے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپؐ کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز آپؐ کو ناپسند ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہم اہل بیت کے لئے اللہ نے دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو چن لیا ہے اور میرے بعد میرے اہل بیت کو بڑی سخت تکلیفوں کا سامنا کرنا ہو گا۔ وہ وطن سے بے وطن ہوں گے۔ اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں مارے مارے پھریں گے۔ میرے اہل بیت کی یہ حالت اس وقت تک رہے گی، جب تک کہ مشرق کی طرف سے ایسے لوگ نہ آئیں گے، جن کے پاس سیاہ جھنڈیاں ہوں گی، وہ خیر و بھلائی کا مطالبہ کریں گے۔ لیکن وہ انہیں نہیں دی جائے گی۔ وہ لڑیں گے کامیاب ہوں گے اور جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ ان کو مل جائے گا۔ یہ لوگ اس چیز کو قبول کر کے ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیں گے، جو میرے اہل بیت میں سے ہو گا۔ یہ دنیا کو اس طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسے اس سے پہلے ان لوگوں نے ظلم و جور سے بھر دیا تھا۔ تم میں سے جس کو یہ زمانہ ملے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے پاس پہنچے خواہ اسے برف پر گھسٹ گھسٹ کر ہی آنا پڑے۔"

ابن ماجہ نے ثوبان سے ایک روایت کی ہے جس میں مذکور ہے کہ تین شخص جو سب کے

سب خلیفہ کے بیٹے ہوں گے لڑیں گے۔ اور جب ان میں سے ایک کے حصے میں وہ "کنز" آ جائے گا تو مشرق سے سیاہ جھنڈیوں والے نکلیں گے۔ وہ تم سب کو قتل کریں گے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا، وہ مجھے یاد نہیں رہا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم اس کو دیکھو تو اس کی بیعت کر لینا اور اس کے پاس برف پر گھسٹتے ہوئے پہنچنا۔ کیونکہ خلیفۃ اللہ مہدی وہی ہے۔ اسی مضمون کی ابن ماجہ نے ایک اور حدیث روایت کی ہے۔ عبداللہ بن حارث بن جزالزبیدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرق کی طرف سے لوگ نکلیں گے جو مہدی کے لئے زمین تیار کریں گے۔

امام ولی اللہ ابن ماجہ کی ان تین حدیثوں پر بحث کرتے ہوئے "ازالۃ الخفا" میں لکھتے ہیں: "فقیر کے نزدیک ان تین حدیثوں کی تحقیق یہ ہے کہ مہدی سے مراد بنو عباس کا خلیفہ مہدی ہے۔ اس مہدی سے وہ مہدی مقصود نہیں، جو آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔ حدیث میں مہدی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسے خلیفۃ اللہ کہا ہے اور اس کی مدد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنو عباس کو تقدیر کی طرف سے خلافت دیئے جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اور اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہ تھی۔ اس سے دراصل یہ بتانا مطلوب تھا کہ اور لوگوں کی طرح جنہوں نے خلافت حاصل کرنے کی کوششیں کیں اور ناکام رہے اور سوائے شور اور گڑبڑ کے ہاتھ کچھ نہ آیا، بنو عباس ناکام نہ رہیں گے۔ چنانچہ بنو عباس کا مہدی اس لیے خلیفۃ اللہ ہے کہ تقدیر الٰہی میں عباسیوں کے لیے خلافت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور یہ فیصلہ کسی طرح رد نہیں کیا جا سکتا۔ بات یہ ہے کہ شریعت میں سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ نزاع نہ رہے۔ ملک میں گڑبڑ کا خاتمہ ہو جائے اور خلافت کا کام استحکام پا جائے، اس لیے مستحکم خلافت خواہ اس کی مسند پر بیٹھنے والا زوال پذیر خلافت کے صاحب اختیار سے کمتر ہو، انتشار اور گڑبڑ سے ہر حال میں بہتر ہے۔"

میرے نزدیک (از مولانا سندھی) اگر اس مہدی کا آنا جو آخری زمانے میں ظاہر ہوگا احادیث

سے صحیح ثابت ہو بھی جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ مہدی اس وقت آئے گا، جب قیامت کی گھڑی قریب آجائے گی۔ اس وقت نہ تو شریعت کے عمل دخل کا امکان رہے گا۔ اور نہ قانون کے نافذ ہونے کی فرصت۔ اس لیے مہدی کے آنے پر مسلمانوں کی فلاح کو معلق رکھنا کسی طرح ٹھیک نہیں ہے۔ بے شک وہ حدیثیں جو مہدی کے آنے کے متعلق امام ولی اللہ نے بیان کی ہیں، وہ علم حدیث کی تیسرے درجہ کی کتابوں میں مروی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان روایتوں کو قبول کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی اصل ہمارے نزدیک ثابت ہے۔ امام ابوداؤد ہلال بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے علیؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماوراء النہر سے ایک آدمی ظاہر ہوگا، جسے حارث کہا جائے گا۔ اس کے پیش پیش ایک اور آدمی ہوگا، جس کا نام منصور ہوگا، یہ میرے اس قول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے زمین ہموار کرے گا۔ جس طرح قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذِ عمل کا ذریعہ بنے تھے۔ اس وقت ہر مومن کا فرض ہوگا کہ اس کی مدد کرے۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ نے شاید یہ کہا ہو کہ اس وقت ہر مومن کا فرض ہوگا کہ اس کی پکار پر لبیک کہے۔

میرے نزدیک (از مولانا سندھی) یہ ساری کی ساری حدیثیں عباسیوں کے مہدی کی طرف بالصراحت اشارہ کرتی ہیں، جیسا کہ امام ولی اللہ نے بیان فرمایا ہے۔ نیز ان حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت سے یہاں سارے کے سارے بنوہاشم مراد ہیں۔ حدیث کے یہ الفاظ کہ یہ مہدی زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنت پر عمل کرے گا۔ اور عدل و انصاف کے متعلق اسلام کے جو قاعدے اور ضابطے ہیں، خود ان کا پابند رہے گا، جیسا کہ بنوامیہ میں عمر بن عبدالعزیز تھے۔ السیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ عباسیوں کا مہدی عمر بن عبدالعزیز کا مثیل ہے۔ دوسرے لفظوں میں مہدی ان ظالم فرمانرواؤں کی طرح نہ ہوگا، جو اپنے آپ کو قوانین اور ضابطوں سے مستثنیٰ قرار دے لیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی عباسی مہدی اُن حدیثوں کا مصداق ہے۔ جن میں اہل بیت میں سے ایک آدمی کے ظاہر ہونے کا

اشارہ کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک حدیث اور ہے جس کو ابو داؤدؒ نے عاصم سے اور عاصم نے زر سے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر دنیا کی عمر ایک دن کی بھی رہ گئی تو اللہ تعالیٰ اس ایک دن کو بھی اتنا لمبا کر دے گا کہ ایک آدمی میرے اہل بیت کا ظاہر ہو۔ اس کا نام میرے نام کا سا ہوگا اور اس کے باپ کا نام بھی میرے باپ کے نام کا سا ہوگا۔ اور وہ ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ مہدی عباسی کا نام محمد بن عبداللہ تھا۔ نیز وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت یعنی بنو ہاشم میں سے تھا۔ چنانچہ امام ولی اللہ کا اشارہ اسی مہدی کی طرف ہے اور یہی وہ مہدی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔

عام طور پر مشہور یہ ہے کہ مہدی حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہوگا۔ چنانچہ بعد کے زمانے میں اصحاب کشف نے اس بات پر بہت زور دیا۔ جب بغداد تباہ ہو گیا اور عباسی خلافت کا نام و نشان مٹ گیا تو مہدی کے اولادِ فاطمہؓ میں سے ہونے پر اور اصرار ہونے لگا، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جن حدیثوں میں مہدی کے فاطمی النسب ہونے کا ذکر آیا ہے، وہ اسناد کے اعتبار سے ضعیف قرار دی گئی ہیں۔ میرے خیال میں ابو داؤدؒ کا یہ رجحان تھا کہ بارہ اماموں میں سے ایک کو مہدی قرار دیں۔ اسی غرض سے موصوف نے مہدی کے باب میں یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایسی روایتیں بھی بیان کی ہیں، جن سے عبداللہ بن زبیر کی خلافت اور لشکر کے دھنس جانے کے قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ نیز امام مالک عبداللہ بن زبیر کو ائمہ میں سے شمار کرتے تھے اور ان کے مقابلے میں عبدالملک بن مروان کی خلافت کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اس باب میں سب سے پہلے وہ حدیث بیان کرتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہدی اہل بیت میں سے ہوگا۔ یہاں وہ اہل بیت کی صراحت نہیں کرتے۔ اس کے بعد جو حدیثیں درج کرتے ہیں، ان میں مذکور ہے کہ یہ مہدی اولادِ فاطمہؓ اور اولادِ حسنؑ میں سے ہوگا۔ لیکن اس باب کے آخر میں جو حدیثیں مروی ہیں،

ان کا مصداق وہ مہدی ہے جو منصور کا بیٹا تھا اور وہ خاندانِ عباسی کا تیسرا خلیفہ ہے۔ غرضیکہ احادیث کو اس ترتیب سے ذکر کرنے سے ان کا مقصد دراصل یہ ہے کہ قارئین یہ جان لیں کہ مرجح قول آخر ہی ہے۔

شیخ ابو الطیب شمس الحق اپنی کتاب "عون المعبود" میں لکھتے ہیں "شیعہ اور ان میں بھی خاص طور پر امامیہ فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امامِ حق حضرت علیؓ ہیں ان کے بعد حسنؓ پھر حسینؓ، پھر زین العابدین، پھر محمد باقر، پھر جعفر صادق، پھر موسیٰ کاظم، پھر علی رضا پھر محمد متقی، پھر علی نقی، پھر حسن عسکری ہیں۔ حسن عسکری کے بیٹے مہدی ہیں، جن کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ مہدیِ منتظر اپنے دشمنوں کے خوف سے روپوش ہو گئے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ یہ ظاہر ہوں گے اور ظلم و جور سے بھری ہوئی زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ ان لوگوں کے نزدیک عمر کا اتنا لمبا ہونا اور زندگی کا اس قدر امتداد کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔"

میرے (از مولانا سندھی) خیال میں اہلِ سنت اور شیعہ کے درمیان اصل نزاع حسبِ ذیل ہے۔ قرآن مجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور اس نے بشارت دی کہ قرآن کا دین سب دینوں پر غالب ہو کر رہے گا۔ اب ہوا یہ کہ اکثر ممالک خلفائے راشدین کے عہد میں مفتوح ہوئے اور ان کے بعد بنو امیہ، بنو عباس اور ہندوستان کے بادشاہوں نے اسلامی سلطنت کی سرحدوں کو وسیع کیا، لیکن شیعہ تو ان میں سے کسی کی سلطنت کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اس لیے ان کے نزدیک قرآن کا یہ وعدہ کہ اس کا دین سب دینوں پر غالب ہو کر رہے گا، ہنوز پورا نہیں ہوا۔ ان کے عقیدے میں یہ وعدہ صرف اولادِ فاطمہؓ میں سے ہی کسی امام کے ہاتھ سے عملی جامہ پہن سکتا ہے۔ الغرض یہ اساس ہے جس پر اُن کے ہاں مہدی کے آنے کے عقیدے کی عمارت بنی۔

باقی رہا اہلِ سنت کا معاملہ سو اُن کے نزدیک تو قرآن کا یہ وعدہ مہاجرین اور انصار کے ہاتھوں پورا ہو چکا۔ وہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو بھی ان مہاجرین اور انصار کی جماعت میں شامل سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی حدیثوں میں فرمایا ہے

کہ میری امت میں جھوٹے دجّال ہوں گے۔ اور یہ بھی خبر دی ہے کہ ایسے ائمہ بھی پیدا ہوں گے۔ جو اصحاب رُشد ہوں گے، اور مہدی ہوں گے۔ کذّابوں اور باطل پرستوں نے دین میں جو فساد برپا کر رکھا ہوگا، وہ اس کی اصلاح کریں گے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ائمہ جیسے کہ قریش کے اور قبیلوں میں سے ہوں گے، ویسے بنو ہاشم میں سے ہوں گے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نفاق میں غلو رکھنے والے امامت اور مہدیت کو نبوت کا درجہ دیتے ہیں۔ اور اسطرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور انبیاء کا آنا مانتے ہیں۔ سو تم عقل سے کام لو اور بے سوچے سمجھے ورق گردانی میں نہ پڑو۔

امام ولی اللہ "فیوض الحرمین" میں لکھتے ہیں" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شیعوں کے بارے میں ایک روحانی سوال پوچھا تو مجھے یہ القا کیا گیا۔ اُن کا مذہب جھوٹا ہے اور اُن کے مذہب کے جھوٹے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ امام کو مانتے ہیں"۔ بعد ازاں جب میں اس (کیفیت وجذب) سے نکلا تو سمجھا کہ ان کے ہاں چونکہ امام معصوم ہوتا ہے، اور اس امام کی اطاعت فرض ہے اور وہ مانتے ہیں کہ اسے باطن میں وحی بھی ہوتی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ نکلا کہ "امام ماننے سے ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے"۔

۱۴۔ چار بنیادی اخلاق:

امام ولی اللہ "ہمعات" میں لکھتے ہیں۔ اس فقیر پر یہ بات روشن کی گئی ہے کہ تہذیب نفس کے سلسلے میں جو چیز شریعت میں مطلوب ہے، وہ چار خصلتیں ہیں۔ حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو انہی چار خصلتوں کو قائم کرنے کے لیے بھیجا۔ تمام ملل حقہ میں انہی چار خصلتوں کا ارشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص ہے "بِرّ" یعنی نیکی ان چار خصلتوں کا حاصل ہے اور گناہ سے مراد وہ عقائد و اعمال و اخلاق ہیں، جو انہیں چار خصلتوں کی ضد ہیں۔

ان چار خصلتوں میں سے ایک "طہارت" ہے۔ اس کی حقیقت کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن یہ گمان نہ کر لینا کہ یہاں طہارت سے مراد وضو اور غسل

ہے۔ طہارت کا اصل مقصود وضو اور غسل کی روح اور اُن کا نور ہے۔ جب آدمی نجاستوں میں آلودہ ہو۔ میل چرک اور بال اس کے بدن پہ جمع ہوں۔ اور بول وبراز اور ریح نے اس کے معدہ میں گرانی پیدا کی ہو تو ضروری اور لازمی بات ہے کہ وہ انقباض، تنگی اور حُبس اپنے اندر پائے گا۔ جب وہ غسل کرے گا۔ زائد بالوں کو دور کرے گا۔ نیا لباس زیب تن کرے گا اور خوشبو لگائے گا تو اسے اپنے نفس میں انشراح، سرور اور انبساط کا احساس ہوگا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ طہارت یہی وجدانی کیفیت ہے۔ جو اُنس اور نور سے تعبیر کی جاتی ہے۔

دوسری خصلت خدا تعالیٰ کے لیے خضوع یعنی نہایت درجہ کی عجز و نیازمندی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سلیم الفطرت شخص جب طبعی اور خارجی تشویشوں سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفات اُس کے جلال اور اُس کی کبریائی پہ غور کرتا ہے تو اس پہ حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی حیرت اور دہشت خشوع، خضوع، اخبات یعنی نیازمندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سوچنے والا انسان جب کائنات کی اس گتھی کو حل کرنے سے عاجز آجاتا ہے اور اس عجز اور افتادگی کی حالت میں کسی اور قوت کے سامنے اپنے آپکو بے دست و پا پاتا ہے تو اس کی یہ بے دست و پائگی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے سے بلند تر کسی اور قوت کو ملنے۔ جب نفس اس کیفیت سے رنگین ہو جاتا ہے اور یہ خصلت اس کے اصل جوہر میں داخل ہو جاتی ہے تو اس شخص اور ملاءِ اعلیٰ کے مابین ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس سے اس شخص پہ وہ معارفِ جلیلہ مترشح ہوتے ہیں، جن کا قالب تجلیاتِ الٰہیہ ہیں۔

تیسری خصلت سماحت اور فیاضی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس طلبِ لذت، حُبِ انتقام، بخل اور حرص وغیرہ سے مغلوب نہ ہو۔ اس ذیل میں عفت، جد و جہد، صبر، عفو، سخاوت، قناعت اور تقویٰ آجاتے ہیں۔ شکم اور فرج کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام عفت ہے۔ آسائش اور ترکِ عمل کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام جد و جہد ہے۔ جزع اور فزع کو روکنا صبر ہے۔ انتقام کی

خواہش کو دبانا عفت۔ خواہشِ بخل کو چھوڑ دینے کا نام سخاوت اور حرص کو قبول نہ کرنا قناعت ہے شریعت کی بنائی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کرنا تقویٰ ہے۔

چوتھی خصلت عدالت ہے۔ سیاسی اور اجتماعی نظاموں کی روح رواں یہی خصلت ہے ادب، کفایت، حریت، سیاستِ مدنیہ اور حسنِ معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں۔ اپنی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنا، عمدہ اور بہتر وضع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف متوجہ رکھنا ادب ہے۔ جمع و خرچ، خرید و فروخت اور تمام معاملات میں عقل و تدبیر سے کام لینا کفایت ہے۔ خانہ داری کے کاموں کو بخوبی سر انجام دینا حریت ہے۔ شہروں اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا سیاست مدنیہ ہے۔ بھائیوں میں نیک زندگی بسر کرنا، ہر ایک کے حق کو پہچاننا اور اُن سے الفت اور شفقت سے پیش آنا حسنِ معاشرت ہے۔ الغرض یہ ایک طویل بحث ہے۔ اگر تفصیل درکار ہو تو حجۃ اللہ البالغہ میں دیکھیے۔

۱۵۔ کسریٰ و قیصر کا نظام:

امام ولی اللہ حجۃ اللہ کے صفحہ ۸۳ میں فرماتے ہیں جب ایرانیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں۔ دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنا لیا۔ آخرت کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وُہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں ہر شخص سرمایہ داری اور تموّل پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہر جمع ہو گئے، جو عیش پسندوں کے لیے عیش پسندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کی غرض سے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے، قوم کے اکابر اس جد و جہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسبابِ تعیش میں کس طرح وُہ دوسروں پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُن کے امراء اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان

کی کمر کا پٹکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو۔ یا ان کے پاس عالی شان سر بفلک محل نہ ہوں، جس میں پانی کے حوض، سرد و گرم حمام، بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں، حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں۔ صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں۔ جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو، اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں، جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مرادف ہے۔

غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے معاشی نظام کا اصل الاصول بن گیا تھا اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ یہ پوری مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کر گیا تھا۔ عوام و خاص سب میں یہی جذبہ فاسد پایا جاتا تھا اور یہ ان کے معاشی نظام کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پہ یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا۔ نا اُمیدی کالی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی۔ اس لئے کہ مفرطانہ عیش پرستی کے لیے زیادہ سے زیادہ درم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی۔ اس کے لیے بادشاہ، نواب، امراء اور حکام نے معاشی دست برد شروع کر دی۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشت کاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کار پردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی۔ انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کر سکیں۔

خلاصہ یہ کہ ظلم و بد اخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔ اس پریشان حالی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اُخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتۂ بندگی جوڑنے کے لئے بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ اس بد فاسد معاشی نظام، کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صفتوں پر نظامِ عالم کی بنیاد قائم ہے،

وہ اکثر یک قلم متروک ہو گئیں اور امراء و رؤساء کی مرضیات و خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ شمار ہونے لگا۔ جمہور کی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بد اخلاقیوں کا نمونہ بن گئی تھی اور ان میں سے اکثر کا گزارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا۔ مثلاً ایک طبقہ جہاد کئے بغیر باپ داد کے نام پر مجاہدین کے نام سے وظیفہ خواری کر رہا ہے تو دوسرا مدبرین مملکت کے نام سے پل رہا ہے۔ کوئی بادشاہ و امراء کی خوشامد میں قصیدہ خوانی کر کے شاعری کے نام سے وثیقہ پا رہا ہے، تو کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے زمرہ میں مالی استحصال کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کسبِ معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور دربار داری کے ذریعہ معاش حاصل کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکارِ عالیہ اور ذہنی نشوونما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست اور ارذل زندگی پر قانع کر دیا تھا۔

پس جب یہ فاسد مادہ وبا کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو ان کے نفوس ذنائت و خبث سے بھر گئے۔ ان کے طبائع اخلاقِ صالحہ سے نفرت کرنے لگے۔ ان کے تمام اخلاقِ کریمانہ کو گھن لگ گیا۔ یہ سب اس "فاسد معاشی نظام" کی بدولت پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کارفرما تھا۔ آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابلِ علاج حد تک پہنچ گیا تو خدا تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے۔ اس نے ایک "نبی امی" (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا اور اسے اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا۔ وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی ان تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظام میں فارس و روم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے ان تمام اسباب کو یک قلم حرام قرار دیا جو عوام اور جمہور پر معاشی دست برد کا سبب بنتے اور

مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیاتِ دنیوی میں بے جا انہماک کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً مردوں کے لیے سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیبا کے نازک کپڑوں کا استعمال، تمام انسانی نفوس کے لیے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال، عالی شان کوٹھیوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش وغیرہ کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی منشا و مولد ہیں۔ (اردو ترجمہ از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ماخوذ از "الفرقان" بریلی) ---- اور اس کے قائم کردہ نظام نے قیصر و کسریٰ کی دولت کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ آپؐ کا یہ ارشاد صحیح ثابت ہوا کہ کسریٰ ہلاک ہوگا اور پھر اس کا نام و نشان نظر نہ آئے گا اور قیصر کی ہلاکت کے بعد اس کا نام لیوا کوئی نہ ہوگا۔

۱۶ امام عبدالعزیز کا خواب:

"امالی عزیزیہ" میں ہے۔ فقیر نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان ہے، جس میں سفید براق فرش بچھا ہے۔ اس فرش پر بہت سے آدمی بیٹھے ہیں جن کی شکلیں نورانی اور لباس فاخرہ ہیں اور جناب امیرؓ (علیؓ کرم اللہ وجہہ) کا انتظار کر رہے ہیں۔ فقیر بھی اسی غرض سے فرش پر بیٹھ گیا۔ ناگاہ کیا دیکھتا ہوں کہ جناب امیرؓ قبلہ کی طرف سے نمودار ہوئے اور ہماری طرف تشریف لائے۔ آپ کی آمد پر سب لوگ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے اور فرش کے کنارے کی طرف آپ کی پیشوائی کے لیے آگے بڑھے۔ فقیر بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور چونکہ باعظمت اشخاص کا کافی انبوہ تھا، اس لیے میں فرش کے کنارے پر آپ کی پیشوائی کے لیے نہ پہنچ سکا۔ میں فرش کے وسط میں کھڑا تھا۔ جناب امیرؓ تشریف لائے۔ صفوں کو چیرتے ہوئے میرے پاس پہنچ گئے اور فرش پر چار زانو بیٹھ گئے۔ میں متادب ہو کر آپ کے مقابل دو زانو بیٹھا۔ آپ نے مجھ پر بہت شفقت فرمائی اور سوائے میرے کسی اور سے کلام نہ کیا۔ فقیر نے اس وقت کو غنیمت جانا اور چند ایک چیزیں جو ذہن میں تھیں، وہ جناب امیرؓ کی خدمت میں عرض کیں اور آپ نے جواب باصواب ارشاد فرمایا۔

سب سے پہلے آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ کسی شخص نے پشتو میں ایک کتاب لکھی ہے، جس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے میری تحقیر نکلتی ہے۔ تمہیں اس کی خبر ہے یا نہیں۔ فقیر نے عرض کیا کہ بندہ پشتو زبان نہیں جانتا اس لیے اس کتاب سے واقف نہیں خدا نے چاہا تو آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اس امر کی تحقیق کروں گا۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ مذاہبِ فقہ میں سے کون سا مذہب جنابؓ کو پسند ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے کوئی مذہب بھی پسند نہیں یا آپ نے یہ فرمایا کہ ان میں کوئی بھی ہمارا شعار نہیں، کیونکہ ہر مذہب افراط و تفریط میں پڑ گیا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ تصوّف کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ جنابؓ کو پسند ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں بھی میرا پہلا سا جواب ہے۔ کیونکہ یہاں بھی اچھی چیزوں کے ساتھ بُری چیزیں ملا دی گئی ہیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں ان میں خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن جہاں تک اصل طریقہ کا تعلق ہے، ہمارے زمانے میں تقرب الی اللہ کا مدار تین چیزوں پر تھا اور یہی تین چیزیں عام طور پر مروج تھیں، ذکر، تلاوت، نماز۔ اتنا فرمانے کے بعد آپ یکایک اٹھ کھڑے ہوئے اور جس سمت سے تشریف لائے تھے۔ اُسی طرف تشریف لے گئے اور لوگ جو ان کے انتظار میں تھے، حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔

”التمہید“ میں (جو مولانا سندھی کی غیر مطبوعہ کتاب ہے) ہے، رجب ۱۱۸۷ھ یا ۱۱۸۸ھ میں شاہ عبدالعزیز نے امیر المومنین علی بن ابی طالب امامِ انقلاب کو خواب میں دیکھا۔ آپؓ نے شاہ عبدالعزیز کو نظامِ اجتماع اور اس میں اصلاح کرنے کے طریقوں کی طرف رہنمائی کی چنانچہ موصوف نے جناب امیرؓ کے ارشاد کی تعمیل کی اور اپنی کوششوں سے عام مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب کے اصحاب عام مسلمانوں کی اعانت سے حکومتِ مُوقتہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس خواب کے ضمن میں سیرتِ سید احمد شہید صفحہ ۸۷ میں مذکور ہے کہ صبح اٹھ کر شاہ صاحب سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی مجددی مظہری متوفی ۱۲۴۰ھ کی خدمت میں تشریف لے گئے۔

موصوف حضرت مرزا جانجاناں مظہر کے خلیفہ تھے۔ شاہ صاحب نے ان سے خواب کی تعبیر چاہی۔ شاہ غلام علی نے فرمایا۔ میری سمجھ میں آتا ہے کہ سید حسن رسول نما کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ان دیار میں ہدایتِ خلق کی طرف بہت کم ہو گئی ہے۔ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کے (یا آپ کے کسی مرید رشید کے) ذریعہ وہ سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔ شاہ صاحب نے فرمایا میرے خیال میں بھی یہ تعبیر آئی تھی۔

مولانا نور الحق صاحب (مرتب کتاب ہذا) لکھتے ہیں۔ مولانا شیخ علم فیہم نے مجھ سے ۲۶ جون ۱۹۴۰ء کو فرمایا کہ یہ خواب امام عبد العزیز کی عظمت پر دال ہے کہ ان کے عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی بغیر آپ کے ممکن نہ تھی۔ رہا یہ فقرہ "یا آپ کے کسی مرید رشید کے ذریعہ" ہمارا خیال ہے کہ یہ فقرہ شاہ غلام علیؒ کے ذمہ لگا کر محض اس لیے بڑھایا گیا کہ سید احمد شہید کی فضیلت ثابت کی جا سکے، ورنہ اصل خواب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(فائدہ) سید حسن رسول نما کا تذکرہ مختصر "خزینۃ الاصفیاء" صہ ۱۸۰ میں موجود ہے۔ آپ کی وفات ۱۱۰۳ھ میں ہوئی۔ امام ولی اللہ تفہیمات صہ ۴۴/۲ (خطبہ) میں لکھتے ہیں۔ میر ابو العلی کے پیرووں میں سے ایک خواجہ محمد بہار گنج کے قریب رہتے تھے۔ انہیں سید حسن رسول نما کی صحبت نصیب ہوئی تھی۔ موصوف لکھتے ہیں کہ ایک روز سید حسن رسول نما قوالی سُن رہے تھے۔ اس میں ایسے شعر گائے جا رہے تھے، جن میں اپنے آپ کو سگِ محبوب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آپ اس تشبیہ سے برابر محظوظ ہوتے رہے، لیکن ہوتا یہ کہ حظ اور لذت کی یہ کیفیت آتی اور چلی جاتی۔ اور طبیعت اس کیفیت پر نہ جم سکی۔ آپ نے یہ کیا کہ ایک طرف تشریف لے گئے اپنے گلے میں رسی ڈالی۔ اس کو میخ سے مضبوط باندھ دیا اور اپنے اوپر جھول ڈالی پھر یہ شعر پڑھنا شروع کیا اور اس میخ کے ارد گرد گھومنے لگے۔ اس طرح کرنے سے آپ پر لذت کی پوری کیفیت طاری ہو گئی اور اس صورت طبیعت کو "بسط" نصیب ہوا۔

۱۷۔ یلغار نادر شاہ:

محمد شاہ کے عہد میں امیر الامراء صمصام الدولہ (متوفی ۱۱۵۱ھ) کی بے تدبیری سے صوبہ کابل اور سرحد ہائے ہند کا انتظام مختل ہوگیا۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کو ایک بہت بڑی مصیبت کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ نادر شاہ کا حملہ تھا۔ کابل کا صوبہ دار ناصر خاں گو مرد صالح تھا مگر وہ سوائے شکار، تلاوت و عبادت کے اور کوئی کام نہ کرتا۔ اس زمانے میں نادر شاہ ایران کے تخت پر قابض ہو گیا تھا۔ اس نے ایران سے چل کر قندھار کے قلعہ کا محاصرہ کیا اور ایک سال تک اس کے محاصرہ میں لگا رہا۔ یہاں تک کہ قندھار سے باہر اس نے نادر آباد کے نام سے اپنا ایک شہر بنا لیا۔ اس کے بعد اس نے ہلہ کر کے قندھار کو بھی فتح کر لیا۔

اس دوران میں کابل کے صوبہ دار نے صرف اتنا کیا کہ وہ کابل سے بھاگ کر پشاور آگیا۔ نادر شاہ نے قندھار سے غزنی اور کابل کا رخ کیا اور کابل کو فتح کر کے سات ماہ تک وہاں پڑا رہا۔ بعد ازاں وہ کابل سے جلال آباد آیا۔ جلال آباد سے اس نے پشاور کی طرف کوچ کیا اور وہاں سے پنجاب آیا۔ لاہور میں نادر شاہ کے آنے کی خبریں پہنچیں تو شہر میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ ۱۵ ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ کو (دہلی کے قریب) معرکہ جنگ گرم ہوا۔ جس میں صمصام الدولہ قتل ہوا۔ اور برہان الملک سعادت خاں والی اودھ اور آصف جاہ نے چند کروڑ روپیہ کے عوض نادر شاہ سے صلح کی طرح ڈالی۔ ۱۰ ذی الحجہ کو محمد شاہ اور اس کے ایک دن بعد ۱۱ ذی الحجہ کو نادر شاہ قلعہ دہلی میں پہنچے اور عید الاضحیٰ کے دن جامع مسجد اور شہر کی دوسری مسجدوں میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

۱۱ ذی الحجہ کا واقعہ ہے کہ بعض ہندوستانیوں نے یہ مشہور کر دیا کہ نادر شاہ چل بسا۔ اس خبر کا پھیلنا تھا کہ نادر شاہ کے سپاہیوں پر جو دو دو، تین تین کی ٹولیوں میں شہر میں گشت کر رہے تھے حملے شروع ہو گئے اور شہر والے انہیں قتل کرنے لگے۔ غرضیکہ ۱۲ ذی الحجہ کی صبح تک یہ ہنگامہ ہوتا رہا۔ آخر ۱۲ ذی الحجہ کو نادر شاہ کی سواری قلعہ سے نکلی اور اس نے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ اس حکم پر کوئی نصف روز گزرا تھا کہ امان کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس کے بعد نادر شاہ نے واپسی کی تیاریاں کریں۔ اس نے سندھ اور صوبہ کابل کو سلطنتِ ایران سے ملحق کر لیا اور پنجاب کے بعض علاقے جن

سے صوبہ کابل کا خراج نکلتا تھا، ان کو بھی اپنے قبضہ میں کیا۔ چنانچہ ۷ ماہ صفر ۱۱۵۲ھ کو نادر شاہ شاہجہاں آباد سے روانہ ہوا۔ (سیر المتاخرین)

۱۸ میر اویس:

افغانستان میں افغانوں کی قومی حکومت میر اویس سے شروع ہوتی ہے۔ میر اویس قندھار کا حاکم تھا۔ اس نے ایران پر حملہ کیا اور یہ سلسلہ اس قدر بڑھا کر ایران میں افغان حکومت قائم ہو گئی جس کے ردِ عمل میں نادر شاہ کا ظہور ہوا۔ میر اویس کی حکومت ایران کی دشمن تھی مگر اس کا تعلق محمد شاہ کی حکومت سے دوستانہ تھا۔ چنانچہ محمد شاہ بھی اس کی سرپرستی کرتا تھا۔ اور اصل میں میر اویس بھی محمد شاہ کا فرمانبردار دوست تھا۔ اس بنا پر سیر المتاخرین کے مصنف کو جو مذہباً شیعہ اور ایرانی شیعہ حکومت کا طرفدار ہے، یہ کہنا پڑا۔

وہ لکھتا ہے، عجیب بات ہے کہ ایران کے صفوی سلاطین نے کسی معاملے میں کبھی سلاطین ہند سے مدد نہیں چاہی، لیکن اس کے باوجود شاہانِ صفویہ میں سے شاہ اسمٰعیل صفوی اور شاہ طہماسپ نے بابر اور اس کے بیٹے ہمایوں سے جو مہر و التفات برتا، وہ ظاہر و آشکارا ہے۔ گو صفوی بادشاہوں کی ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں سے کوئی غرض وابستہ نہیں تھی، لیکن پھر بھی وہ ان کی طرف سفیر بھیجتے رہتے اور تہنیت و تعزیت کے پیغامات کا سلسلہ ان کے ساتھ جاری رکھتے، لیکن سلاطین ہند نے ان کی اس مہر و محبت اور وفاداری کا پاس نہ کیا۔ ایران میں فتنہ و فساد برپا ہوا۔ آخر میں شاہ طہماسپ ثانی اپنے آباؤ اجداد کے تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا اور حملہ آور افغان ایران سے نکال بھی دیئے گئے۔ لیکن محمد شاہ نے اس معاملے میں بالکل خاموشی اختیار کی اور طہماسپ ثانی کو کوئی تہنیت کا پیغام نہ بھیجا۔ اس کے خلاف اس نے یہ کیا کہ میر اویس افغانی سے آشنائی و مودت کا رشتہ قائم رکھا۔ اور تو اور میر اویس کے بیٹے حسین سے بھی جو آخر میں قندھار کا حاکم تھا اور لشکر لے کر ملتان تک چڑھ آیا تھا اور ان نواح میں اس نے بڑی قتل و غارت اور لوٹ مار کی تھی کوئی پرسش نہ کی اور اس سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔

واضح رہے کہ مغربی افغانوں نے ایران پر حملہ کیا۔ ان کا سردار محمود خاں تھا اس نے ۱۱۳۴ھ میں اصفہان کو فتح کر لیا۔ حسین شاہ صفوی شاہِ ایران کو قید کر لیا اور دار الخلافہ پر قبضہ کر کے وُہ خود بادشاہ ہو گیا۔ تین برس سلطنت کر کے ۱۱۳۷ھ میں مر گیا۔ بعد ازاں اس کا رشتہ دار اشرف جانشین ہوا۔ شاہِ ایران تو افغانوں کی قید میں تھا مگر شہزادہ طہماسپ وہاں سے نکل کر شمال مغربی اضلاع میں جو اب تک افغانوں نے فتح نہیں کیے تھے، بادشاہ بن گیا۔ ۱۷۲۲ء میں قسمت سے اس کو ایک لائق اور مستقل مزاج آدمی مل گیا اور وُہ نادر شاہ تھا۔ اس کا اصلی نام نادر قلی خان پسر امام قلی تھا۔ قوم اس کی افشار تھی۔ وُہ کچھ رتبہ کا آدمی نہ تھا۔ بعض اس کو پوستین دوز بتاتے تھے۔ نادر کے لڑکے کی شادی جب محمد شاہ کی بیٹی سے ہُوئی ہے اور دلہن والوں کے دستور کے مطابق دولہا سے اپنی سات پشت تک نام پوچھے تو نادر نے کہا "بگو دامادِ شما پسر نادر شاہ است۔ نادر پسر شمشیر تا ہم چنیں تا ہفتاد بار شمار۔" نادر شاہ ۱۱۰۰ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی شہامت و جلادت و شجاعت کے کام دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے۔ وہ ملک کے ملک اور صوبے کے صوبے فتح کرتا چلا گیا۔ سب سے عظیم الشان کام اس کا یہ تھا کہ اس نے ایران کو ۱۱۴۲ھ میں بالکل پٹھانوں سے پاک صاف کر دیا تھا۔ اس کے عوض بادشاہ نے خراسان، مازندران، سیستان، کرمان اس کو بخش دیئے۔ اس نے ۱۱۴۸ھ میں ایران کی سلطنت کو اتنی وسعت دی کہ اس کی حدود اپنی قدیمی صورت پر قائم ہو گئیں۔ ۱۱۵۰ھ میں خاندانِ صفویہ کا خاتمہ ہوا۔ اب وُہ مستقل بادشاہ بن گیا اور ۱۱۵۱ھ میں ہندوستان پر آندھی کی طرح چڑھ آیا۔ (تاریخ ذکاء اللہ صہ ۳۴۸/۹)

لہ۱۹ احمد شاہ ابدالی:

۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ اپنے ملازموں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ احمد خاں درّانی پہلے نادر شاہ کے ہاں پیادل تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بڑا افسر بن گیا۔ جب نادر مر گیا تو خود غزنین اور قندھار پر مسلّط ہو گیا اور وہاں اپنے نام کا سکّہ اور خطبہ جاری کرایا۔ نادر شاہ کے زمانے سے ناصر خاں صوبہ دار کابل

تھا۔ احمد خان ابدالی نے بھی اس کو بدستور اپنے عہدے پر قائم رکھا، مگر پانچسو سوار دُرانی اس کے ساتھ کئے تاکہ پانچ لاکھ روپیہ جس کے دینے کا اس نے وعدہ کیا تھا، فوراً بھیج دے۔ ناصر خاں کابل پہنچ کر وعدے سے پھر گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس پر لشکر کشی کی، وہ بھاگ کر پشاور پہنچا۔ جب احمد شاہ ابدالی اس طرح سرحد پر آیا تو اس نے سرحد اور پنجاب کا بُرا حال دیکھا۔ اس پر وہ لاہور کی طرف بڑھا۔ جب محمد شاہ کو خبر ہوئی تو اس نے دلّی سے ایک فوجِ جرّار روانہ کی۔

احمد شاہ ابدالی لاہور پر قابض ہو کر ستلج کے کنارے پہنچا۔ اس کے پاس بارہ ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی۔ کیونکہ وہ فوج کی کثرت کے بجائے اس کی طاقت و قوت پر اعتماد رکھتا تھا۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ کو اس نے سرہند پر قبضہ کر لیا اور آگے بڑھا۔ ستلج کے کنارے ۱۵ ربیع الاول سے ۲۸ ربیع الاول تک دونوں فوجوں میں سخت جنگ ہوئی۔ اسی اثناء میں جاوید خواجہ سرا نے جو بادشاہ کے منہ چڑھا ہوا تھا شاہ درانی کو صلح کا پیغام دیا۔ بادشاہ محمد شاہ نادر گردی دیکھے ہوئے تھے، اس نے ملتان اور لاہور ہر دو صوبے دے کر صلح کر لی اور غنیمت جانا کہ بلا ٹلی۔ احمد شاہ ہر دو صوبے معین الملک پسر قمر الدین خاں کو دے کر واپس چلا گیا۔ پھر ۱۱ ستمبر ۱۱۷۰ھ کو دوبارہ دہلی آیا اور دلی کو اس طرح لوٹا کہ نادر گردی کو بھی مات کر دیا۔ وہ خود تو نادر کی طرح سفاک و بے رحم نہ تھا۔ مگر اس کی سپاہ سپاہِ نادری کی نسبت زیادہ اجڈ تھی۔ لوٹ کا کام دو ماہ تک جاری رہا۔ بعد ازاں سلطنت کے حصّے اپنی مرضی سے کر کے امراء میں تقسیم کئے اور شوال ۱۱۷۱ھ کو واپس آگیا۔

(سیر المتاخرین و تاریخ ذکاءاللہ)

نئے ہندوستان کے افغان صُوبے:

ہندوستان ایک مملکت کا نام نہیں ہے۔ یہ دراصل عبارت ہے ایک براعظم سے جو بہت سے ملکوں پر مشتمل ہے۔ شیخ محمد قاسم انیسویں صدی کی تاریخ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ہندوستانی ایک قوم نہیں ہے بلکہ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں کا، جو نسل، زبان، دین اور اپنی عادات کی بناء پر ایک دوسرے

سے جُدا جُدا ہیں۔

مشہور مورخ مسعودی لکھتا ہے کہ اہل علم و نظر و بحث میں سے ایک جماعت کا بیان ہے کہ عہد قدیم میں ہندوستان بڑی عزت و رفعت کا مالک تھا، جہاں نیکی اور دانائی کا دَور دَورہ تھا۔ ہوتے ہوتے ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان میں ایک سلطنت کی بنا رکھی گئی۔ چنانچہ اس کا پہلا بادشاہ برہما اعظم تھا۔ اس نے حکماء کو جمع کیا۔ اسی کے عہد میں کتاب "السند ہند" لکھی گئی اور "دھر الدھور" کے نام سے اس کی تفسیر مرتب ہوئی۔ اس سے بعد میں مجسطی جیسی کتابیں لکھی گئیں اور مجسطی کا نتیجہ بطلیموس کی کتاب ہے۔ برہما کی شخصیت کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ بعض اسے حضرت آدم علیہ السلام سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ وہ بعض کا خیال ہے کہ برہما بادشاہ کا نام ہے اور یہی بات زیادہ مشہور ہے۔

ہندوستان ایک وسیع و عریض رقبہ ہے۔ اس میں بڑے بڑے میدان، دریا اور پہاڑ ہیں۔ ہندوستان ایک طرف خراسان سے ملا ہوا ہے، دوسری طرف تبت سے۔ اور ان ملکوں کے درمیان پہاڑ حد فاصل ہیں۔ ان ملکوں کے درمیان لڑائیاں اور جھگڑے رہتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کی زبانیں جُدا جُدا ہیں۔ رائیں مختلف ہیں۔ چلپی اپنی کتاب "کشف الظنون" میں لکھتا ہے۔ ہندوستان والے اعلیٰ آراء اور عمدہ احکام کے مالک رہے ہیں۔ انہوں نے حساب، ہندسہ، طب، نجوم اور دوسرے طبعی اور الٰہی علوم میں بڑی بڑی تحقیقات کیں۔ ہندوستان کے عام جمہور صابی ہیں اور کواکب کی تنظیم اور ان کے دوروں کے متعلق ان کی خاص رائیں اور مسلک ہیں۔ آزاد بلگرامی "سبحۃ المرجان" میں لکھتا ہے۔ ہندوستان میں کبھی دہلی، سندھ، دکن اور سیلون تک کے علاقوں کو شمار کر لیا کرتے ہیں۔ کابل، ہندوستان اور خراسان کے درمیان ایک برزخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ زمانہ دراز سے یہ ہندوستان کی حکومت میں شامل ہے اور بعض دفعہ ہندوستان سے صرف دہلی کی سلطنت مراد ہوتی ہے۔

میرے (مولانا سندھی) نزدیک وہ علاقے جہاں کے دریا بہہ کر دریائے سندھ میں ملتے ہیں، مثلاً کابل اور ہندوکش پہاڑ کے جنوب کے اطراف۔ نیز وہ اضلاع جہاں پشتو بولی جاتی ہے، جیسا کہ

قندھار اور اس کے ارد گرد کا رقبہ ہے یہ سب کے سب ہندوستان کا ایک حصّہ ہیں اور پشتو اصل میں سنسکرت زبان سے ہی نکلی ہے۔ میرے خیال میں حکومتوں کے الگ الگ ہونے سے یہ سرزمین ہندوستان سے جُدا نہیں ہو سکتی اور میں نے تمام تاریخی شواہد کو اپنے اس دعویٰ کا مؤید پایا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مسلمان مورخ اس علاقہ کو ہندوستان سے الگ مانتے آئے ہیں۔ لیکن یہ ان کی بھول ہے۔ انہوں نے کبھی اس رقبہ کی زبان اور یہاں کے مقامات کے ناموں کی تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مولوی ذکاء اللہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ عربی میں غیر قوموں کے ناموں کی تعریب کر کے لکھنے کا قاعدہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس سبب سے ناموں کا پتہ لگانا نہایت دشوار ہے۔ فرنگی محققین نے ان ناموں کی تحقیق میں بہت سے کورے کاغذ سیاہ کئے مگر بے سود۔ ان ناموں کی تحقیق دراصل ان محققین کا کام ہے، جو عربی اور سنسکرت ہر دو زبانوں کے فاضل ہیں۔ وہ سنسکرت دانی سے تحقیق کر سکتے ہیں کہ اصل نام کیا تھا۔ اور عربی دانی سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ کیونکر اس کی تعریب ہوئی۔ ایک تاریخ میں لکھا ہے کہ بادشاہانِ کابل کا نام رنبتیل، کوئی رنبیل، کوئی زنبیل، کوئی رت مل کوئی رن ٹھیلی اور کوئی رن بل لکھتا ہے۔ یہ ایک بامعنی ہندو نام ہے۔ یہ بھی محققین نے تحقیق کی ہے کہ کابل میں جو ترک کوہستان تبت سے آئے تھے۔ ان کا مذہب بدھ تھا۔ ان ترکوں سے برہمنوں کے ہاتھ اور برہمنوں سے راجپوتوں کے ہاتھ سلطنت منتقل ہوئی۔

میرے (مولانا سندھی) خیال میں جب ترک یہاں آئے اور انہوں نے اپنی بستی بسائی تو یہ جگہ گائیوں کی چراگاہ تھی اور اس کا نام "گئوپال" تھا۔ پھر گئوپال بگڑ کر کابل۔ جب مسلمانوں نے کابل پہ حملہ کیا تو یہاں کا حاکم رام پال نامی تھا جس کے نام کو بگاڑ کر انہوں نے زنبیل بنا دیا واللہ اعلم

۲۱ حنفی فقہ :

امام ابوحنیفہ انقلابی سیاست کے مالک تھے۔ آپ فقہ کو ایسے طریقہ پر مرتب کرنا چاہتے

تھے کہ ایرانی ذہنیت اسے آسانی سے قبول کر سکے۔ کتاب و سنت سے استنباط عرب کی ذہنیت کے لیے بہت مناسب ہے۔ وہ قرآن عظیم بچپن سے سمجھتے ہیں۔ احادیث اور آثار کے متعلق بھی ان کے علماء کو فی الجملہ علم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اکثر مسائل کتاب و سنت سے بہ آسانی مستنبط ہو سکتے ہیں۔ البتہ بعض دقیق مسائل میں وہ کسی امام کی تقلید کر لیتے ہیں، مگر جب خلافت کا نظام ایرانیوں کے ہاتھ آگیا۔ ان کی ذہنیت اس طرز تفقہ کی محتاج نہیں تھی اور وہ ہر چیز کو ایک عقلی اصول کے ذریعہ حل کرنا ضروری جانتے تھے۔

عام طور پر لوگ امام ابوحنیفہ کی فقہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں عامہ اہلِ سنّت سے تفرد اختیار کیا گیا ہے۔ اور یہ امام ابوحنیفہ کی ذہنی تاثر کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جب "کتاب الآثار" للامام محمد پڑھی تو ہمیں اس شبہ پر ہنسی آئی۔ ہر ایسا قول جس میں امام ابوحنیفہ عام اہل علم سے متفرد سمجھے گئے اور اس کو شاذ قرار دیا گیا۔ وہ اقوال سب کے سب ابراہیم نخعی سے منقول پائے۔ ابراہیم نخعی عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں ایک مسلّم امام ہیں۔ سفیان بن سعید ثوری بھی انہی کے طریقے کے ایک عالم ہیں۔ آگے چل کر امام بخاری کا ابراہیم نخعی سے خصوصی انتساب ہے۔ بخاری اسحاق سے، وہ عبداللہ ابن مبارک سے، وہ سفیان ثوری سے، وہ تلامذہ ابراہیم نخعی یعنی منصور، اعمش، حماد، حکم سے روایت کرتے ہیں۔ اول الذکر سفیان کے حدیث میں اور آخر الذکر فقہ میں ان کے استاد ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ خصوصی کمال ہے کہ وہ ابراہیم کی فقہ کو معقول بنا دیتے ہیں۔ اور اس میں سے آئندہ ضرورت کے مطابق استنباط کرنے کے لیے قواعد وضع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ یہ کام نہ کرتے تو ایرانی فقہا اور منتظمینِ خلافت کبھی اسلامی فقہ کو نہ چلا سکتے۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ ایسا احسان ہے، جس کی امت اسلامیہ ہمیشہ ممنون رہے گی۔ مگر اس کے ساتھ ان کی انقلابی سیاست اس فقہ کو کامیاب ہونے نہیں دیتی تھی۔ عام اہلِ علم ان کا نام سن کر بھاگتے تھے کہ کہیں ہم بھی حکومت کے عتاب میں نہ آجائیں۔

امام ابویوسفؒ نے اس مشکل کو حل کر دیا۔ یہ عباسی خلافت کے ساتھ ہو گئے۔ اور امام صاحب

سے مسلک یعنی علویوں کی تائید سے دست کش ہو گئے۔ اس طرح عباسی خلافت کو چلانے کے لیے جس قدر قانون کی ضرورت تھی، انہوں نے امام ابو حنیفہ کی فقہ سے مدد لے کر اسے منظم کر دیا۔

بات یہ ہے کہ حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک تو فقہا کا مرجع خلیفہ راشد رہا۔ فقہا اپنے اجتہاد پر عمل کرتے اور ان کا اختلاف مُضر شکل میں ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اس لیے کہ ان کے عمل کے لیے زمینیں مختلف تھیں۔ مثلاً ایک فقیہ نے مغرب میں ایک طرح کا حکم دیا۔ دوسرے نے مشرق میں اس کے خلاف کہا۔ لوگوں کو یہ علم ہی نہ ہو سکا کہ یہ دو فقیہ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ اس لیے کوئی دقت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ البتہ حجاز میں یا مدینہ منورہ میں (بہ زبانِ خلیفہ راشد) اگر فقہا کا اختلاف ظاہر ہوتا تو خلیفۂ راشد کا حکم اس کا فیصلہ کر دیتا۔ اس سے وُہ اختلاف بھی ضرر کے درجے تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔

اس کے بعد بنی اُمیہ کے دَور میں ساری توجہ فتوحات پر مرکوز رہی اور فقہا کا طرزِ عمل ویسا ہی رہا، جیسے خلافتِ راشدہ میں تھا۔ یعنی مختلف ممالک میں اگر کوئی اختلاف ہوتا تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا۔ اور صُوبوں کے گورنروں کو اپنے اپنے لیے قاضی مقرر کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ جب کبھی مرکزِ خلافت میں فقہا میں نزاع پیدا ہوتا، تو بنی اُمیہ کا خلیفہ اتنا علم رکھتا تھا کہ وُہ فقہا کے مختلف اقوال سن کر ایک قول کو ترجیح دے سکے۔ ہم نے ہشام بن عبدالملک کے بعض فتاویٰ ایسے دیکھے ہیں کہ آج تک فقہا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور جب خلیفہ ترجیح سے عاجز آ جاتا تو فقہائے مدینہ کا فیصلہ دریافت کر لیتا۔ واضح رہے کہ بنی اُمیہ نے علمی مرکز مدینہ ہی میں رہنے دیا تھا۔ اسے دمشق میں منتقل نہیں کیا تھا۔ البتہ عباسیوں نے سیاسی مرکز اگر بغداد کو بنایا تو علمی مرکز بھی وہیں منتقل کر لیا۔ اسی لئے ان کے خلیفہ نے امام مالکؒ سے کہا کہ مُوطّا کی تعلیم بجائے مدینہ کے بغداد میں آ کر دیجیے۔ مگر امام مالکؒ مرکز کو چھوڑنے پر کب تیار ہو سکتے تھے؟ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

اب عباسی دور میں ایک نئی چیز پیدا ہوتی ہے۔ مدینہ منوّرہ کے بجائے بغداد علمی مرکز بنتا ہے لیکن عباسی خلفاء میں اتنی علمیت نہیں رہ جاتی کہ وُہ مختلف اقوالِ فقہ میں ترجیح دینے کی استعداد رکھیں،

جیسے بنی اُمیہ کے خلفاء میں تھی۔ چنانچہ خلافت کے تمام اطراف بعیدہ سے مختلف فتاوی مرکز میں جمع ہونے لگے۔ اس لیے کہ اب حکمران طاقت ایرانی ہے۔ وہ کسی فقیہ کے فتوی کو نہ سمجھ سکتی ہے، نہ ترجیح دے سکتی ہے۔ صوبہ کے گورنروں کے اختیار بھی معطل ہیں، اس لیے ہر اختلاف کو وہ بھی مرکز کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔

ان حالات میں خلیفہ کے ساتھ ایک زبردست عالم کا ہونا ضروری تھا، جو ان تمام جھگڑوں سے اس کو نجات دلا سکے۔ اس سلسلے میں پہلے پہل خلیفہ منصور عباسی نے سعی کی کہ علمائے اہلِ مدینہ اس کے طرفدار بنیں، مگر ان سے اس کا توافق نہ ہو سکا۔ اب منصور محتاج ہوا کہ اہلِ عراق کے فقہاء سے استمداد کرے۔ وہ امام ابوحنیفہ کو اس کا اہل سمجھتا تھا، مگر حضرت امام کے سیاسی اختلافات کے باعث وہ ان سے استفادہ نہ کر سکا۔ امام ابویوسف نے یہ ہمت دکھائی اور تمام ممالکِ خلافت کی قضا کو منظم کر دیا، جس سے آپ کا لقب قاضی قضاۃ العالم ہوا۔ آپ نے عدالتوں میں مختلف مراتب قائم کر کے مرکزِ خلافت کو اپیل کی آخری عدالت بنا دیا، لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ تمام قلمرو میں ایک ہی قانون نافذ ہو۔ امام ابویوسف نے امام ابوحنیفہ کی فقہ پر غور کر کے ایک قابلِ عمل نظام نامہ مرتب کر لیا۔ اور امام محمد بن حسن شیبانی کو اس کی تعلیم کے لیے مخصوص کر دیا۔ اب جو قاضی امام محمد کے یہاں سے پڑھ کر نکلا، فقط وہی کسی مملکت میں قاضی بنایا جاتا۔ چھوٹے قاضی وہ اپنے تلامذہ سے منتخب کر کے مقرر کر لیتا تھا۔ اس طرح ان دو بزرگوں (ابویوسف و محمد) کے اتفاق سے تمام ممالکِ خلافت ایک قانون کے پابند ہو گئے۔

یہ خلافتِ عباسیہ کا سب سے قابلِ فخر زمانہ ہے۔ اس میں امام ابوحنیفہ کا کمال جس قدر مانا جائے گا، اس کے ساتھ امام ابویوسف اور امام محمد بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ یہ ہے فقہ حنفی اور ائمہ حنفیہ کی حقیقت۔

ہمارے خیال میں جو کام امام ابویوسف اور امام محمد ہر دو نے کیا، شاہ ولی اللہ کی فقہ، تصوف اور حدیث کو رواج دینے میں وہ اکیلے امام عبدالعزیز نے کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے دو بھائی شاہ

رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر ان کے معاون تھے، مگر فیصلہ کن رائے فقط شاہ عبدالعزیز کی ہوتی تھی۔ ان دونوں کے اس تعاون نے ہندوستان کو عالمگیر کے بعد پھر ایک دفعہ ایک قانون (فقہ حنفی عزیزی) کا پابند بنا دیا۔ اب آپ ہندوستان میں کوئی عالم حنفی نہیں پائیں گے جس پر شاہ عبدالعزیز کا احسان نہ ہو۔ مارک اور باغی ہر اجتماع میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے کوئی اجتماعی قوت بدنام نہیں ہو سکتی۔

۲۳۔ ہندوستان میں شیعی دعوت

سلطان محمود نے ۳۹۱ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا اور پشاور کے قریب مقام ہنڈ پر جے پال والی لاہور کی فوج کو شکست دی۔ نواح ملتان میں اس سے پہلے قرامطہ نے اپنی سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ ملتان کا مشہور عظیم الشان مندر جسے محمد بن قاسم ثقفی نے محض اس لیے نہ چھیڑا تھا کہ **وما البد الا ککنائس النصاریٰ والیہود وبیوت النیران للمجوس** (بدھ کا یہ مندر نصاریٰ کے گرجوں، یہودیوں کی عبادت گاہوں، مجوسیوں کے آتش کدوں کے حکم میں آتا ہے) قرامطہ نے اس کو مسمار کر کے وہاں اپنا گورنمنٹ ہاؤس تعمیر کر لیا تھا۔ سلطان محمود نے قرامطہ کو شکست دے کر اس عمارت کو مسجد کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ اس واقعہ پر ایک زمانہ دراز گزرنے کے بعد جب ہمایوں ہندوستان سے فرار ہوا تو وہ سیدھا شاہ اسمٰعیل صفوی کے پاس ایران پہنچا۔ اس نے ایرانی حکومت سے ایک باقاعدہ معاہدہ کر کے ایران سے فوجی امداد لی اور پھر کامیاب ہوا۔ وہ معاہدہ کیا تھا؟ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ہمارے نزدیک ہمایوں ایران کی تابعداری کا وعدہ کر آیا تھا اور اسی لیے اکبر کو ملکی حکومت پیدا کر کے استقلال کے دعویٰ کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ اس نے ہندوؤں کو ساتھ ملا لیا تاکہ ملکی حکومت پیدا ہو۔ اور ایرانی حکومت سے کہا جا سکے کہ جس حکومت نے تابعداری کا وعدہ کیا تھا۔ وہ نہیں رہی اور اس کے بجائے ایک نئی قومی ملکی حکومت قائم ہے جسے معاہدۂ معلومہ سے ذرہ برابر تعلق نہیں۔ واضح رہے کہ ہندوؤں کا ملانا اکبر کی ایجاد نہیں۔ شیر شاہ، فیروز شاہ، ناصر الدین حسن یہ کام پہلے کر چکے تھے۔ مگر

ملکی حکومت بنانا یہ اکبر کی ایجاد اور اس کی اختراع ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہمایوں کا بیرم خاں والد عبد الرحیم خانخاناں کے توسل سے شاہِ ایران سے معاہدہ ہوا۔ ورنہ شاہِ ایران دل سے ہمایوں کو امداد دینا نہیں چاہتا تھا۔ جب ہمایوں نے منظور کر لیا کہ میں شیعہ مذہب کو ہندوستان میں رائج کروں گا اور شیعہ ایجنٹ بیرم خان کو اپنے ساتھ رکھوں گا تب کہیں جاکر اسے امداد دی گئی۔ ہمایوں کے بعد جب اکبر تخت نشین ہوا اور اس کو اپنی سلطنت کی حقیقت سمجھ میں آئی تو سب سے پہلے اس نے بیرم خان کو علیحدہ کیا۔ بیرم خان ایران کی راہ سے حج کو جانا چاہتا تھا۔ اکبر نے اس کو روک دیا اور پھر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد کوئی ایجنٹ ایران سے نہیں آیا — اکبر نے ایرانی اثر کی بیخ کنی کے لیے ہندوستان سے ”اسلامی حکومت“ کو ختم کر کے اس کے بجائے ملکی حکومت پیدا کی۔ اب اس پر نہ تو کوئی سُنی خلیفہ زور ڈال سکتا تھا اور نہ کوئی شیعہ بادشاہ تحکم چلا سکتا تھا۔ اکبر جیسا انصاف پسند بادشاہ ہندوستان نے پیدا نہیں کیا۔ قانون کے سامنے اس کا بیٹا اور دشمن دونوں مساوی تھے۔

شمالی ہند کے علاوہ جنوبی ہند میں گولکنڈہ شیعوں کا مرکز تھا، جہاں تانا شاہ برسرِ حکومت تھا۔ اسے سلطان عالمگیر نے ختم کر دیا۔ اواخر ذیقعدہ ۱۰۹۸ھ میں ابو الحسن گرفتار ہو کر دولت آباد کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ سیر المتاخرین کا شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

”گولکنڈہ کے قلعہ کے استحکام، سرزمین حیدرآباد کی خوبی اور اس کی آب و ہوا کی لطافت کو کوئی کہاں تک بیان کرے۔ وہاں کا بادشاہ ابو الحسن لہو و لعب اور عیش و طرب میں اوروں سے زیادہ منہمک ہو گیا اور اس کی وجہ سے ملک میں بھی فسق و فجور کا عام رواج ہوا۔ عالمگیر نے جو بظاہر اپنے آپ کو اہلِ اصلاح میں سے بتلاتا تھا اور اپنے آپ کو تارکینِ دنیا کی شکل میں ظاہر کرتا تھا، حیدرآباد کو دار الجہاد قرار دیا۔ چنانچہ وہاں کے باشندے بے دریغ قتل کیے گئے اور اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اصل میں عالمگیر کا مقصد ابو الحسن کے شہرۂ آفاق خزانوں کو ہتھیانا، وہاں کے علمائے شیعہ کا استیصال کرنا اور عام مومنین کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانا تھا۔“

اس کے بعد محمد شاہ کے آخری عہد میں لکھنؤ شیعوں کا مرکز تھا۔ اس مرکز سے دہلی پر غلبہ حاصل

کرنے کی مسلسل سعی جاری رہی۔ اس کو رد کرنے کے لیے شاہ عبدالعزیز نے "تحفہ اثنا عشریہ" کی دیوار کھڑی کی۔ جب عوام شیعیت کے پراپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں تب کہیں انہیں "ازالۃ الخفاء" پڑھائی جا سکتی ہے۔

الخطیب ابی زرعہ رازی سے روایت کرتے ہیں "انہوں نے کہا کہ جس شخص کو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں نقص نکالتے پاؤ اس کو زندیق سمجھو۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ رسول حق ہیں، قرآن حق ہے اور رسول نے جس امر کی دعوت دی وہ بھی حق ہے۔ اب رسول، قرآن اور رسول کی دعوت کا سارا حال ہمیں صحابہ کے واسطے سے معلوم ہوا۔ چنانچہ صحابہ کے نقص نکالنے والے اصل میں کتاب اور سنت کو باطل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ بے شک یہ لوگ زندیق ہیں۔ (الاصابہ ص۱۰)

ہارون الرشید کے سامنے زندیقوں کا سردار شاکر لایا گیا، ہارون نے اس کی گردن مارنے کا ارادہ کیا۔ اسی سلسلے میں شاکر سے پوچھا گیا کہ تم لوگ سب سے پہلے اپنے شاگردوں کو صحابہ کے "انکار" اور "قدر" کی تعلیم کیوں دیتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ صحابہ کے انکار سے دوسرے لفظوں میں یہ مقصود ہے کہ جس دین کو وہ نقل کرتے ہیں، وہ باطل ہے۔ کیونکہ جب نقل کرنے والا مشکوک ہے تو جو چیز وہ نقل کرے گا وہ کس طرح قابلِ اطمینان ہو سکتی ہے۔ خطیب بغداد ص۳۰۴

امام فضل اللہ شیخ سعدی کے معاصر تورپشتی حنفی جن کے حالات "طبقات السبکی" میں ہیں، اپنی کتاب "المعتمد" باب سوم فصل چہارم میں لکھتے ہیں "جو لوگ ابوبکرؓ کی خلافت پر اعتراض کرتے ہیں، وہ گویا تمام صحابہ پر زبانِ طعن کھولتے ہیں۔ اور صحابہ کو مطعون کرنا در اصل دین کی اساس کو مطعون قرار دینا ہے۔ کیونکہ قرآن، حدیث اور ان کے متعلقہ احکام ہم تک صحابہ ہی کے واسطے سے پہنچے ہیں۔ اگر صحابہ اُن کے قول کے مطابق غلط رو تھے تو ظاہر ہے جو چیز انہوں نے نقل کی، وہ کس طرح قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے۔ الغرض صحابہ کو اس طرح مطعون کرنے سے شریعت ہی کالعدم ہو جاتی ہے۔

("الیواقیت والجواہر للشعرانی ص۲۳۶)

۲۳؁ مولانا رفیع الدین

مولانا رفیع الدین کی تصنیف "اسرار المحبۃ" کا ایک قدیم نسخہ پرنسپل مولوی محمد شفیع صاحب اورنٹیل کالج لاہور کی لائبریری میں موجود ہے۔ گزشتہ ماہ اگست ۱۹۴۱ء میں خاکسار راقم نے اس سے استفادہ کیا۔ نقل لینے کا ارادہ تھا لیکن ناگہاں بیمار پڑنے کے باعث یہ کام سرانجام نہ پا سکا۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔ رسالہ مذکور میں یہ دکھایا گیا ہے کہ محبت سب اشیاء میں ساری ہے اور قرآنِ حکیم کی جس قدر آیتیں محبت کے متعلق ہیں، مصنف ان کو ساتھ ساتھ حل کرتے جاتے ہیں اس موضوع پر صرف فارابی اور بوعلی سینا نے کچھ لکھا ہے۔ بوعلی سینا کا ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:۔ ھَبطت الیک مِنَ المکان الارفع (یہ محبت) ایک بلند مرتبت مقام سے تیری طرف نازل ہوتی ہے)

اس کے جواب میں آپ نے ایک قصیدہ طنّانہ لکھا، جس کا مطلع ہے:۔

عَجَباً لِشیخٍ فیلَسُوفٍ الحَقِّ ۔ خَفِیتْ علیہ مَنَارَۃٌ مِنْ شرعٍ (اس ذہین فطین شیخ پر مجھے تعجب ہے کہ اس پر شریعت کا روشن منارہ مخفی رہا)

اس قصیدے کا مقطع یہ ہے:۔

ثم الصلوۃ علی النبی والہٖ والحمد للّٰہ العلی الارفع !!

(پھر نبیؐ اور آپؐ کی آل پر درود و سلام اور حمد و ثنا خدائے بلند و برتر کے لیے) رسالہ "اسرار المحبۃ" کے تین جز ہیں۔ تحصیل، تذییل، تفصیل۔ دیکھو ابجد العلوم صفحہ ۲۵۴۔

رسالہ تکمیل الاذہان کا اکثر حصہ ابجد العلوم میں آچکا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحات ۱۲۷ تا ۱۳۲، ۲۳۵ تا ۲۷۔ بالفاظ دیگر حصہ منطق کے ماسوا ساری کتاب ابجد میں آگئی ہے۔ اس کتاب کے مختلف نسخے حسب ذیل مقامات پر موجود ہیں۔

(۱) پیر صاحب العلم سندھ کے کتاب خانہ میں اس کا ایک نسخہ تھا، جس سے راقم عاجز نے اپنا نسخہ نقل کیا اور نسخہ منقولہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ (۲) حافظ عبدالعزیز ولد مولوی احمد صاحب بہاولپور۔ (۳) مولوی عبدالتواب ملتانی (۴) مولوی عبدالعزیز یا مولوی عبدالتواب کے نسخے سے مولانا نجم الدین صاحب سابق ہیڈ مولوی اورنٹیل کالج نے اپنا نسخہ نقل کرایا۔ (۵) مولوی سلطان محمود ملتان۔

شاہ رفیع الدین کی تصانیف کی ایک عام خصوصیت شیخ محسن نے "یانع جنی" میں یہ بیان کی ہے کہ ان میں بکثرت رموزِ خفیہ درج ہوتی ہیں، جن پر بہ مشکل اطلاع نصیب ہوتی ہے نیز یہ کہ وہ تھوڑے سے الفاظ میں جہانِ معنی آباد کر دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں خصوصیتیں تکمیل الاذہان میں نمایاں ہیں۔ کتاب مذکور میں چار باب ہیں۔ منطق، فن تحلیل، امورِ عامہ" تطبیق الآراء۔ ایسی جامع کتاب پہلے نہیں لکھی گئی (نور الحق علوی)

۳۔ رسالہ "حملۃ العرش"، کا تذکرہ شیخ محسن نے "یانع جنی" میں کیا ہے۔ تفسیر عزیزی مطبوعہ بمبئی میں آیت " وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ " کی تفسیر میں شاہ عبدالعزیز نے وہ رسالہ نقل کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ " برادر فضائل آئیں کمالات آگیں شیخ محمد رفیع الدین سلمہ اللہ وزادہ فی الدنیا والدین فتوحاً وبرکاتاً متواتراً ومتوالیاً۔ در بعض تصنیفات خود چنیں نوشتہ اند کہ حملۃ العرش جمعے باشند کہ حاملِ کمالات اربعہ الٰہیہ اند یعنی ابداع وخلق وتدبیر وتدلی الخ، (ص ۹۹) " اللہ اُسے سلامتی دے۔ اور دنیا اور دین میں اپنی مسلسل اور پیہم برکتوں اور فیوض سے نوازے۔ اُس نے اپنی بعض تصنیفات میں یوں لکھا ہے کہ "حَمَلَۃُ العرش" (فرشتوں کی) وہ جماعت ہے، جو اِن چار کمالات۔ ابداع۔ خلق، تدبیر اور تدلّی کی حامل ہے ...... (ص ۹۹) مگر گمان غالب یہ ہے کہ منقول شدہ عبارت رسالہ مذکور کا ٹکڑا ہے۔ پورا رسالہ نہیں (واللہ اعلم محمد نور الحق)

تفسیر آیت نور۔ شیخ محسن نے "یانع جنی" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ تفسیر آیت "اللہ

نور السمٰوٰت والارض" رسالہ "سطعات" از حکیم الہند امام ولی اللہ میں موجود ہے۔ شاہ رفیع الدین کا یہ رسالہ اسی کی تکمیل ہے۔ دوسرے حکماء اس مسئلے کو کس طرح حل کرتے ہیں، وہ سب اقوال اس میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں ایک نئی بات یہ ہے کہ پہلے حکماء کے چار فرقے بیان کیے جنہوں نے حقائق اشیاء پر بحث کی ہے۔ پانچویں فریق کا امام اپنے والد ماجد کو لکھا ہے، کہتے ہیں، **فھو اعمھم فکرا واجمعھم علماً**۔ یعنی وہ فکر وسیع اور جامعیت رکھتے ہیں۔

پھر ہر مسئلے میں پانچوں مذہب علیٰحدہ علیٰحدہ نقل کرتے جاتے ہیں۔ وہ مذاہب حسب ذیل ہیں (سلف اہلِ حدیث متکلمین، صوفیاء کرام" حکماء اشراقیہ ومشائیہ) یہ چاروں فرقے حقائق اشیاء یعنی ان کی حکمت سے بحث کرتے ہیں، لیکن امام ولی اللہ کا مسلک ان سب سے اجمع، اعم اور ایقن ہے۔ رسالہ مذکور کا ایک نسخہ ریاست بہاولپور کے شہر احمد پور شرقیہ میں مولوی عبدالعزیز ولد مولوی احمد صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ہمارے پاس بھی مکہ معظمہ میں اس کی ایک نقل پہنچی۔ معلوم نہیں کہ ہماری کتابوں کے ساتھ اس کو بھی ہندوستان لایا گیا ہے یا نہیں۔

۲۴۔ شیخ خالد کردی

حضرت شیخ غلام علی (عرف عبداللہ) مجددی مظہری "مجدد مائۃ ثالث عشر" شمار ہوتے ہیں۔ دہلی کی خانقاہ مجددیہ انہیں کے نام سے آباد ہے۔ آپ کی ذات سے اس قدر فیض جاری ہوا کہ بقول شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی، شاید ہی اگلے مشائخ میں کسی سے اس قدر فیض ہوا ہو۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا شہر تھا، جہاں آپ کا کوئی خلیفہ نہ ہو۔ صرف ایک شہر انبالہ میں آپ کے پچاس خلفا تھے۔ آپ ہی کے خلیفہ شیخ خالد کردی تھے جن کے مناقب میں علامہ شامی نے مستقل رسالہ تالیف فرمایا۔ جس کا نام "سل الحسام الہندی لنصرۃ مولانا خالد النقشبندی" تھا۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو چکا ہے۔ اس میں ان کا ۱۲۲۴ھ میں براہِ ایران پورے ایک سال کے سفر کے بعد دہلی پہنچنا، شاہ غلام علی کی خدمت میں پہنچ کر فیض یاب ہونا، قطب ارشاد بن کر

واپس وطن جانا اور وہاں مرجع خاص و عام ہونا، ان سب باتوں کا مفصل ذکر ہے۔

اس رسالے میں لکھا ہے کہ جس شام کو مولانا خالد کردی دہلی پہنچے تو آپ نے ایک زوردار قصیدہ لکھا، جس میں آپ نے اپنے سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنے مرشد کی تعریف کی ہے اس قصیدے کے پہلے اشعار یہ ہیں۔

كَمَلَتْ مسافة كعبة الآمال   حَمْدًا لِمَنْ قد مَنَّ بالاكمال

مَنْ نَوَّرَ الآفاق بعد اظلامها   وهَدىٰ جميع الخلق بعد ضلال

اعني غلام علي القرم الذّي   من لحظة يحيي العظام البال

آرزوؤں کے کعبے کی مسافت پوری ہو گئی۔ حمد و ثناء اُس ذات کی جس نے کمال تک پہنچنے کا مجھ پر احسان کیا۔ جس نے اندھیرے آفاق کو روشن کر دیا اور گمراہی کے بعد تمام خلقت کو ہدایت کی راہ دکھائی۔ میری مراد رہنما و پیشوا غلام علی سے ہے۔ جو اپنی نظروں سے بوسیدہ ہڈیوں کو نئی زندگی دیتا ہے۔

شیخ محسن نے اپنی کتاب ”یانع جنی“ میں اس قصیدہ کو پورے کا پورا نقل کر دیا ہے۔

شیخ مراد القزانی ”رشحات“ کے ذیل میں لکھتے ہیں۔ شیخ غلام علی ۱۱۵۸ھ میں بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ آپ دہلی میں مولانا مظہر جانجاناں کی خدمت میں پہنچے اور پورے پندرہ سال تک ان سے اخذ فیض کرتے رہے۔ بعد میں آپ اتنے مشہور ہوئے کہ دُور و نزدیک سے طالبانِ ہدایت آپ کے پاس پہنچتے تھے۔ چنانچہ آپ سے فیض پانے والے زمین کے ہر حصہ میں، شرق و غرب میں اور عرب و عجم میں پھیل گئے۔

شیخ کردی کا نسب باپ کی طرف سے تو سیدنا عثمانؓ سے ملتا ہے اور آپ کی ماں سادات علویہ میں سے تھیں۔ موصوف نے شیخ عبد اللہ (غلام علی) سے نقشبندی مجددی طریقہ لیا۔ پھر بعد میں آپ شاہ عبد العزیز کی مجلس میں بیٹھے جو اپنے زمانے کے ملک العلماء تھے۔ شیخ خالد کردی کے مرشد شیخ غلام علی نے انہیں شاہ عبد العزیزؒ کے پاس جانے کو کہا تھا۔ شاہ صاحب نے شیخ موصوف

کو اپنے علوم کی روایات کرنے کی اجازت دی۔ آپ کی وفات ۱۲۴۲ھ میں ہوئی۔

شاہ عبدالغنی محدثِ دہلوی نے شیخ خالد کا ایک فارسی قصیدہ نقل کیا ہے، جس کے انسٹھ شعر ہیں مطلع اور زمین ملاحظہ ہو ؎

خبر از من دہید آں شاہِ خوباں را بہ پنہانی   کہ عالم زندہ شد بار دگر از ابر نیسانی

شیخ کی مدح میں کہتے ہیں ؎

امامِ اولیا سیاح بیدائے خدا بینی   ندیم کبریا تیاح دریائے خدادانی
مہینِ راہنمایاں شمعِ جمعِ اولیائے دیں   دلیلِ پیشوایاں قبلۂ اعیانِ روحانی
چراغِ آفرینش مہرِ برجِ دانش و بینش   کلیدِ گنجِ حکمت محرمِ اسرارِ سبحانی
امینِ قدسِ عبداللہ شہ کز التفاتِ او   دہد سنگِ سیاہ خاصیتِ لعلِ بدخشانی

مقطع ؎

زجامِ فیض خود کن خالدِ درماندہ را سیراب   کہ او لب تشنہ مستسقی و تو دریائے احسانی

اسی قصیدہ کا وہ شعر ہے جو متن میں درج ہے ؎

بدہلی ظلمتِ کفر است، گفتند و بدل گفتم   بظلمت رو اگر در جستجوئے آبِ حیوانی

حضرت شاہ عبدالغنی محدثِ دہلوی مہاجر مدنی اپنے رسالہ "تذکرہ حضرت شاہ غلام علی" میں لکھتے ہیں "مولانا خالد شہرزوری کردی نے علماء ہند میں سے حضرت شاہ عبدالعزیز کی مدح کی۔"

(شیخ محسن صفحہ ۴۸) محمد نور الحق)

میں (مولانا سندھی) نے مکہ معظمہ میں خالد کردی کے مطبوعہ مکاتیب دیکھے، سال بھر میں ایک بار وہ دہلی ایک خط لکھا کرتے تھے اور حجاج کی معرفت خط پہنچانے کا انتظام تھا۔ خط میں مولانا محمد اسماعیل شہید کا تذکرہ اس طرح کرتے جیسے کوئی کسی کا دل سوز دوست ہو۔ ساتھ ہی شیخ خالد مولانا شہید کے علمی ترفع کے بھی بہت زیادہ معترف ہیں۔ ان خطوط میں "حضرات ثلاثہ" کی اصطلاح خاص طور پر برتی جاتی ہے "حضرات ثلاثہ" کا لفظ اہلِ دہلی کی زبان میں امام عبدالعزیز اور ان کے

دو بھائیوں مولانا رفیع الدین اور مولانا عبد القادر کے لیے بولا جاتا تھا۔

۲۵ شیخ محمد بن عبد الوہاب

شیخ محمد بن عبد الوہاب ابن سلیمان ہیں۔ شیخ موصوف ۱۱۱۵ھ میں نجد کی بستی عینیہ میں پیدا ہوئے اور آپ ہی کی طرف وہابی جماعت منسوب کی جاتی ہے۔ شیخ محمد بن عبد الوہاب نے جب دعوت وتبلیغ شروع کی تو موصوف درعیہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں کے امیر محمد بن سعود نے آپ کی اطاعت کرلی۔ یہ واقعہ ۱۱۵۹ھ کا ہے اس کے بعد وہابی تحریک کو بڑا فروغ ہوا اور نجد اور عمان تک اس کا اثر پھیل گیا۔ ۱۲۰۰ھ میں حجاز اور یمن پر بھی وہابیوں کی عملداری ہو گئی۔

امام شوکانی کے شاگرد محمد بن ناصر حازمی لکھتے ہیں۔ شیخ محمد بن عبد الوہاب صاحبِ علم بزرگ تھے۔ آپ کا طبعاً دینی قیادت کی طرف رجحان تھا۔ موصوف کے رسالے مشہور خاص وعام ہیں۔ ان میں سے بعض تو قابلِ قبول ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو رَد کیے جاتے ہیں۔ شیخ موصوف کی دو باتیں ہیں جو پسند نہیں کی جاتیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انہوں نے چند بے اساس امور کی بنا پر تمام دنیا کو کافر قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ داؤد بن سلیمان نے شیخ موصوف کے اس دعوے کا نہایت مناسب رَد لکھا ہے۔ ان کی دوسری زیادتی یہ تھی کہ بلا کسی دلیل وحجت کے انہوں نے بے گناہوں کو قتل کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ شیخ موصوف یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ جس نے اللہ کے سوا کسی اور سے دُعا کی یا کسی نبی، بادشاہ اور عالِم کو اس میں وسیلہ بنایا تو وہ مشرک ہے، خواہ وہ دل سے چاہے یا اس کا انکار کرے۔ وہ اس کا عقیدہ رکھتا ہو یا اس کو نہ مانتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے روئے زمین کے سب مسلمانوں کو تکفیر کا نشانہ بنا دیا۔ چنانچہ جو مسلمان اولیاء سے دعا کرتے ہیں، ان کو موصوف نے کافر قرار دیا۔ اور جو اُن کے کفر میں شک کرے، شیخ موصوف نے ان شک کرنے والوں کو بھی کافر ثابت کیا۔

آپ ان لوگوں سے جو آپ کے مخالف تھے جہاد کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ جس طرح بھی بس

چلے ان کو قتل کرنا روا جانتے تھے اور ان کے مال و دولت کو لوٹنے کی اجازت دیتے تھے۔ موصوف نے اس طرح دنیا جہان کے مسلمانوں کو زمرۂ کفار میں داخل کر دیا۔ گو شیخ نے شریعت کے ایک حصے کو جانا تو ضرور لیکن آپ نے اس میں امعانِ نظر سے کام نہ لیا۔ دراصل موصوف نے کسی ایسے استاد سے علم حاصل نہ کیا تھا، جو انہیں صحیح ہدایت کی راہ پر لگاتا۔ نفع مند علوم کی طرف ان کی رہنمائی کرتا اور دین کے معاملات میں ان میں تفقہ اور سمجھ پیدا کرتا۔ طلب علم کے سلسلے میں موصوف نے صرف اتنا کیا کہ شیخ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم کی بعض کتابیں پڑھ لیں اور ان کی تقلید کی۔ درآں حالیکہ یہ دونوں بزرگ تقلید کو جائز نہ سمجھتے تھے۔

شیخ سید محمد امین جو ابن عابدین کے نام سے مشہور ہیں، شرح الرد المختار میں باغیوں کے ذکر میں لکھتے ہیں "ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں محمد بن عبدالوہاب کو ماننے والے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں یہ لوگ نجد سے نکلے اور حرمین پر قابض ہو گئے۔ یہ اپنے آپ کو حنبلی مذہب کے پیرو کہتے ہیں۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ اپنے سوا باقی سب مسلمانوں کو جو ان کے اعتقادات کے مخالف ہوں، کافر سمجھتے ہیں۔ اور ان کا خون بہانا جائز جانتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اہل سنت اور ان کے علماء کو قتل کرنے میں دریغ نہ کیا۔ ۱۲۳۳ھ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی طاقت کو توڑا اور ان پر مسلمانوں کے لشکر کو فتح دی۔"

محرم کی آٹھویں تاریخ ۱۲۱۸ھ میں ہفتہ کے روز دن دھاڑے انہوں نے حرم محترم پر حملہ کیا تھا۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب اس سے پہلے ۱۲۰۶ھ میں انتقال کر چکے تھے۔ یہ حملہ شیخ موصوف کے صاحبزادے عبداللہ بن عبدالوہاب کے عہد میں ہوا۔ (ابجد العلوم صفحہ ۱۸۷)

۲۶ طریقہ امام ولی اللہ و طریقہ محمد بن عبدالوہاب

نواب صدیق حسن خاں "حطہ" میں لکھتے ہیں "امام ولی اللہ دہلوی کا مسلک یہ ہے کہ وہ زیر بحث مسائل کو اوّل تو کتاب اور سنّت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ پھر اُن کے متعلق فقہا کے

جو اقوال اور آراء ہیں، ان کو کتاب اور سنت کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ جو فقہی اقوال ان دونوں پر پورے اُتریں، انہیں تو قبول کر لیتے ہیں۔ اور جو ان کے خلاف نظر آئیں، انہیں رد کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں وُہ کسی شخصیت کی پروا نہیں کرتے۔ یہی کیفیت ان کے پوتے مولانا محمد اسماعیل شہید کی ہے۔ موصوف نے اپنے جدامجد کے اسی طریقہ کی پیروی کی۔ اور خدانخواستہ جیسا کہ جاہل سمجھتے ہیں، آپ نے اسلام میں کوئی نئی بات اپنی طرف سے جاری نہیں کی۔ شاہ اسماعیل شہید کا یہ طریقہ حنفی فقہ کے خلاف نہ تھا اور یہی وُہ شاہراہِ شریعت ہے جس پر اسلاف اور ان کے بعد آنے والے چلتے رہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے مُردہ سنتوں کو زندہ کیا۔ بہت سے شرکوں اور بدعتوں کو مٹایا اور خدا نے انہیں شہادت فی سبیل اللہ کا درجہ عطا فرمایا۔ لیکن خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں نے مرحوم کے معاملے میں بے جا تعصب برتا۔ اور ان کے ساتھیوں اور ان کے پیروؤں سے ناروا طور پر دشمنی کی۔ چنانچہ ان کے طریقہ کو شیخ محمد عبدالوہاب سے منسوب کر دیا۔ اور انہیں وہابی کہنے لگے۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ بزرگ نہ نجد کو جانتے تھے اور نہ صاحب نجد کو۔ یہ گھرانا حنفی فقہ کا متبع اور پاک نفوس کا حامل تھا۔“

مولانا شہید نے اپنی کتاب ”تقویۃ الایمان“ میں ”توسل فی الدعاء“ کو جائز اور شرکِ اصغر کے مرتکب کو کافر نہ مانتے ہوئے غیر مغفور قرار دیا ہے۔ یہ دو اساسی مسئلے ہیں جو محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کے مناقض ہیں۔

”توسل فی الدعاء“ سے مراد یہ ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ سے استدعا کی جائے بحرمتِ فلاں یا بحق فلاں کہہ کر۔ تو اس توسل کو ابن عبدالوہاب نہایت شدت سے ممنوع قرار دیتے ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل کے ہاں یہ توسل ناجائز نہیں ہے۔ تقویۃ الایمان میں وُہ اس کے جواز کی تصریح کرتے ہیں۔ لیکن ”یا شیخ عبدالقادر شیئاً“ میں جہاں ذاتِ الٰہی کو توسل کے درجہ پر لایا گیا ہے ہر دو کے ہاں ناجائز ہے۔ یہ ہے توسل فی الدعاء کا مسئلہ۔ جس میں ہر دو طرف ایک دوسرے

کی نقیض ہیں۔

شرکِ اصغر کا مسئلہ حسبِ ذیل ہے۔ آیت اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (نساء۔ ۱۱۶) بے شک اللہ اُس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اُس کا شریک بنایا جائے۔ اور اُس کے سوا (اور گناہ) جس کو چاہے بخش دے گا۔ کی تفسیر میں ہر دو کا اختلاف ہے۔ اس آیت کا ظاہری اقتضا یہی ہے کہ شرک غیر مغفور ہے اور ماوراِ شرک دوسرے کبائر قابلِ مغفرت ہیں۔ یہ اس آیت کا ظاہری تقاضا ہے۔ اب شرک کا لفظ دو درجوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ شرکِ اکبر، شرکِ اصغر، شرکِ اکبر تو یقیناً کفر ہے۔ اہلِ اسلام میں سے کسی شخص کو بھی اس میں اختلاف نہیں۔ بے شک وُہ غیر مغفور اور ابدی عذاب کا باعث ہے۔ شرکِ اصغر کو اہلِ علم کبائر میں شمار نہیں کرتے۔ محمد بن عبدالوہاب اس کو شرکِ اکبر سے ملاتے ہیں۔ چونکہ نص میں عموم ہے۔ اس لیے وُہ اس میں تخصیص کی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو مسلمان شرکِ اصغر میں مبتلا ہوا اس کا اسلام ان کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ مثلاً "یا شیخ" اور مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰہِ فَقَدْ اَشْرَکَ، جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی پس اُس نے شرک کیا۔ وغیرہ امور۔ یہاں عام اہلِ علم اور ابن عبدالوہاب کا اختلاف واضح ہو گیا۔

مولانا شہید یہاں حکم کے طور پر ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ شرکِ اصغر کی بھی جس قدر سزا مقرر ہے۔ وُہ مغفور نہیں ہو گی۔ شرکِ اصغر کبائر میں شامل نہیں۔ اس کی سزا اس کے مرتکب کو ضروری طور پر بھگتنا پڑے گی، مگر وُہ کفر کے برابر نہیں کہ ابدیت عذاب اس میں ثابت ہو۔ ابن عبدالوہاب آیتِ مذکورہ میں شرک کی تخصیص سے مانع تھے۔ ہم نے بھی اس کی تخصیص نہیں کی بلکہ اس کا عموم بحال رکھا۔ اور عموم بحال رکھ کر حکم میں جو اہلِ علم کا متفقہ مسئلہ ہے، صحابہ اور تابعین کے عہد سے لے کر کہ شرکِ اکبر و اصغر میں فرق ہے، اس کو قائم رکھا۔ مولانا اسمٰعیل اس تحقیق میں منفرد ہیں۔ مسلمانوں میں ہم نے اب تک کسی عالم کے کلام میں اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں دیکھا اور "تقویۃ الایمان" میں ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ....... الخ کے متعلق جو فائدہ لکھا، اس

میں اس کی تصریح کردی۔ ہم نے نجدی علماء کو لطافت سے اس پر متنبہ کیا۔ وہ سن کر حیران رہ گئے۔ پھر کبھی انہوں نے اس پہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اس سے ان کے امام کی ساری لیلی منہدم ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ مولانا شہید کی بات کا انکار بھی نہیں کرسکتے۔ ہمارے سامنے انہوں نے اس بات سے انکار نہ کیا اور مولانا شہید کی عظمت کا اعتراف کر لیا۔

ان حالات کے بعد ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہر دو تحریکیں ایک ہیں۔ ہندوستان سے بعض اہلِ حدیث مکہ معظمہ آتے رہے اور نجدیوں کو یقین دلاتے رہے کہ مولانا اسماعیل شہید تمہارے ہم مسلک ہیں۔ ہم نے جب ان کو مابہ الفرق سمجھایا تو وہ حیران رہ گئے کہ اہلِ حدیث کیسے ہیں کہ اپنے امام کی باتوں کو بھی نہیں سمجھتے۔ ہم نے کہا۔ یہ اور زیادہ تعجب انگیز ہے کہ وہ کتاب سلیس اردو میں لکھی ہوئی ہے

۲۷۔ امام شوکانی :-

محمد بن علی بن محمد شوکانی ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۷۲ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ نے تمام علوم اور ان کی جملہ اجناس، انواع اور اصناف میں تبحر حاصل کیا۔ آپ کو محققین شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ نصیب ہوا۔ نیز آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن کی تعداد ۶۵ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے نیل الاوطار" نام کی کتاب ایسی ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں۔ اس میں موصوف نے ہر مسئلے کی دادِ تحقیق دی ہے اور کہیں انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ آپ نے دوران بحث میں اپنے آپ کو اسلاف کے مذہب کا سرتاپا مقید نہیں رکھا۔ امام شوکانی کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنی تمام تصنیفات میں یہ کتاب سب سے زیادہ پسند ہے اور یہی میرے بلند پایہ اسلوبِ تحریر کا نمونہ ہے۔ موصوف کے شاگردوں نے بارہا اس کتاب کو آپ سے پڑھا اور اہلِ علم نے اس سے استفادہ کیا۔ امام شوکانی نے یہ کتاب اپنے اساتذہ کی زندگی میں لکھی تھی۔ چنانچہ اس میں جو سقم رہ گئے تھے، اساتذہ نے ان کی طرف توجہ دلائی اور ان کی اصلاح کر دی گئی۔ شوکان ایک شہر کا نام ہے۔

امام شوکانی کا انتقال ۱۲۵۰ھ جمادی الآخرۃ میں ہوا۔ (ابجد العلوم صفحہ ۸۷۸۔)

کتاب "التمہید" میں ہے (مولانا سندھی) فرماتے ہیں۔ میں نے امام محمد بن علی شوکانی کی فقہ امام حسین بن محسن یمنی سے حاصل کی تھی۔ موصوف نے محمد بن ناصر حازمی اور احمد بن محمد بن علی شوکانی سے پڑھا تھا۔ یہ دونوں بزرگ امام شوکانی کے شاگرد تھے۔ میں ایک طویل عرصہ تک امام موصوف کی تصنیفات سے استفادہ کرتا رہا اور مجھے اس کے اعتراف کرنے میں تامل نہیں ہے کہ ان کتابوں کی مدد سے اللہ تعالیٰ نے میرے لیے ارباب تحقیق کے طریقہ کو سمجھنا آسان کر دیا۔ لیکن امام شوکانی کے بہت سے اجتہادی مسائل ایسے ہیں جن سے مجھے اتفاق نہیں۔ بہر حال میں یہ مانتا ہوں کہ وہ منصف مزاج عالم دین ہیں۔ اصول و فروع میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ مذہباً زیدی ہیں اور سنت کی ترویج و اشاعت میں کوشاں ہیں۔ لیکن اہل سنت کے فقہا نیز اہل ظاہر کے ساتھ بہت سی باتوں میں اتفاق نہیں کرتے۔ چنانچہ جو شخص امام ولی اللہ اور ان کے پیروؤں کے طریقہ سے واقف ہے، وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ولی اللہی طریقہ کے اہم اور واضح اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اصول ہو یا فروع، ہر دو میں نہ شیعیوں کے امامیہ فرقے سے متفق ہیں اور نہ زیدیوں سے۔ ہم اس امر کی وضاحت کے لیے امام شوکانی کے مسلک اور ولی اللہی طریقہ سے ایک ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

امام شوکانی اپنی کتاب "ارشاد الفحول" میں لکھتے ہیں۔

اجماع کے مسئلہ میں علماء میں اختلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اجماع کا ہونا فی نفسہٖ ممکن ہے۔ یا اگر اجماع ہو بھی تو اس کے علم کا کہاں تک امکان ہو سکتا ہے۔ پھر اجماع کی روایت ممکن ہے یا نہیں۔ نیز کیا اجماع شرعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے؟ جمہور کا تو یہ خیال ہے کہ اجماع شرعی حجت ہے۔ لیکن نظام، شیعیوں کا امامیہ فرقہ اور بعض خوارج اسے شرعی حجت نہیں مانتے۔ اور ظاہر ہے کہ اجماع شرعی حجت تو اس وقت ہی ہو سکتا ہے، جب خود ہماری نظروں کے سامنے اجماع ہو۔ لیکن جب وہ ہمارے سامنے عملی شکل میں نہیں آتا تو وہ کس طرح شرعی حجت بن سکتا

ہے۔ اس کے بعد امام شوکانی اجماع کو شرعی حجت ماننے والوں کے دلائل بیان کرتے ہیں اور ان کا جواب بھی دیتے ہیں۔

آخر میں وہ اس بحث کو یوں ختم کرتے ہیں ،،خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم ان امور پر غور کرو اور اصل حقیقت کو جاننے کی کوشش کرو تو تم پر حق بات صاف صاف آشکارا ہو جائے گی اور اس میں کوئی شک وشبہ نہ رہے گا۔ فرض کیا اگر ہم اجماع کو شرعی حجت ماننے والوں کا دعویٰ تسلیم بھی کر لیں اور اجماع کے ممکن ہونے اور اس کے علم کے حصول کے امکان کو مان لیں تو پھر بھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اجماع کا ہونا حق ہے۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ وہ چیز جس پر اجماع ہوا فی نفسہٖ حق ہے اور اس کا اتباع شرعی لحاظ سے واجب اور ضروری ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہر مجتہد راہِ صواب پر ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہوتے کہ دوسرے مجتہد کے لیے اس مجتہد کے اجتہاد پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جب یہ بات تمہارے ذہن نشین ہو گئی تو تم آسانی سے جان لو گے کہ صحیح راہ کون سی ہے۔ اہلِ علم نے اجماع کے مسئلے میں جو لکھا ہے، اب اسے ہم ذکر کر دیتے ہیں تاکہ ہماری بات صاف ہو جائے،،

اجماع کے مسئلے پر مولانا اسمٰعیل شہید اپنی کتاب ،،اصول فقہ،، میں لکھتے ہیں:۔

،،اجماع سے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ اجماع یا تو بسیط ہوتا ہے، بسیط سے یہ مراد ہے کہ ایک امر پر اجماع کرنے والوں کا اتفاق ہو۔ یا اجماع مرکب ہوتا ہے۔ اور مرکب سے مطلب یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ باتوں پر اتفاق ہو۔ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ ان دو یا دو سے زیادہ باتوں میں ایک نہ ایک چیز مشترک ہو۔ پھر اجماع یا تو حقیقی ہوتا ہے، حقیقی ان معنوں میں کہ سب کے سب اپنی زبانوں سے اتفاق رائے کا اظہار کریں۔ اور اگر کوئی خاموش بھی رہے تو یہ خاموشی رضامندی کے مرادف ہو۔ ایک اجماعِ حکمی ہے، جو اجماعِ حقیقی کے خلاف ہوتا ہے۔ پھر ایک اجماع قوی ہے۔ قوی سے مراد یہ ہے کہ عہدِ ماضی اور زمانۂ حاضر کے سب مسلمانوں کو اجماع سے پورا اتفاق ہو۔ ایک متوسط اجماع ہے، جو اہلِ حق کے اتفاق سے عبارت ہے۔ یہ اجماع صرف صحابہ ہی کے زمانہ میں ممکن تھا۔ اس نوع کے

اجماع کی تیسری قسم اجماعِ ضعیف ہے اور وہ صحابہ کے بعد کا اجماع ہے۔ بہرحال "اجماعِ حقیقی بسیط" خواہ وہ قوی ہو یا متوسط، قطعی درجہ رکھتا ہے۔ اور اس کی حیثیت اثبات اور تعارض کے اعتبار سے "مشہور حدیث" کی سی ہے۔ اس کے علاوہ جو اجماع ہے وہ ظنی اور مشکوک ہے۔"

مولانا سندھی فرماتے ہیں :-

اگر تم اس کلام کی تفصیل چاہو تو امام ولی اللہ کی کتابوں اور خاص طور پر "ازالۃ الخفا" کی طرف رجوع کرو۔ گو میرے پاس امام شوکانی کے مسلک اور ولی اللہی طریقہ میں جو اساسی اختلافات ہیں، ان کی بہت سی اور مثالیں بھی موجود ہیں۔ لیکن یہاں میں نے صرف ایک ہی مثال پہ اکتفا کیا ہے۔ اور یہ صحیح راہِ عمل کے تعین میں اصولی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ احکام جو اجماعِ متوسط سے ثابت ہو چکے ہیں، ولی اللہی طریقہ کے نزدیک صحیح راہِ عمل میں داخل ہیں۔ لیکن امام شوکانی ان کو شرعاً حجت نہیں مانتے (کتاب التمہید صفحہ ۶۱)

اب اجماع کے شرعی حجت ہونے پر مدار ہے صدیق اکبر کی خلافت اور مصحفِ عثمان کے متواتر ہونے کا۔ ہم جدید اصطلاح میں اجماع کے بجائے جمعیت مرکزیہ کا فیصلہ استعمال کرتے ہیں۔ آج جس چیز کو جمعیت مرکزیہ کا فیصلہ کہا جاتا ہے، اسی چیز کو اُس زمانے میں اجماع کہتے تھے۔ اس قسم کے فیصلوں کو حجت مانے بغیر کبھی کوئی سیاسی تحریک دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی، لہٰذا شیعہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر اہلِ سنت کا مدار ہی سراسر اسی پر ہے۔ الغرض غور کرنے والے پر ہر دو مسلکوں کا فرق زیادہ دیر تک مخفی نہیں رہ سکتا۔

۲۹ھ امام ربانی مجدد الف ثانی :-

امام ربانی کی دعوتِ تجدید کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے جلال الدین اکبر بادشاہ کے متعلق چند امور کا جاننا ضروری ہے۔ جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر ہندوستان سے فرار ہوا تو وہ سیدھا شاہ اسمٰعیل صفوی کے پاس ایران پہنچا اور ایرانی حکومت سے باقاعدہ معاہدہ کرنے

کے بعد اس کی مدد سے وہ کھوئے ہوئے تخت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ہمایوں نے منظور کیا تھا کہ میں شیعہ مذہب کو رائج کروں گا اور شیعہ "ریجنٹ" بیرم خان کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اکبر نے شیعیت کی بنیاد کاٹنے کے لیے ملکی حکومت کی طرح ڈالی۔ اب اس پر نہ کوئی سُنی خلیفہ دباؤ ڈال سکتا تھا۔ اور نہ کوئی شیعہ بادشاہ حکم چلا سکتا تھا۔ اکبر جیسا انصاف پسند بادشاہ ہندوستان نے پیدا نہیں کیا۔ اس کے نزدیک قانون کی نظر میں اس کا بیٹا اور دشمن مساوی تھے۔

ہم حرم محترم میں علماء، مشائخ، سلاطین، ہر ایک کے لیے فرداً فرداً نام لے کر[1] کلام الٰہی و اذکار وغیرہ کا ثواب ان کی روحوں کو بھیجتے تھے، مگر اکبر کو چھوڑ دیتے تھے۔ ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک چبوترہ ہے، جو کافی بلند ہے، مگر ہے سادہ۔ اس پر اکبر تن تنہا کھڑا ہے، سامنے دار پر ایک شخص لٹک رہا ہے اور ہم کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ ہم نے اس کی تعبیر یہ کی کہ ہند میں انصاف کرنے والا فقط اکبر ہے، جس نے انصاف کی روح کو قائم رکھا۔ اور ہندو مسلم کو یکساں موقع دیا کہ وہ انصاف سے متمتع ہوں۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ مسلمان تو انصاف سے متمتع ہوں اور ہندو بوجہ ہندو ہونے کے رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا (مائدہ ــ ۲) اور لوگوں کی دشمنی اس وجہ سے کہ انہوں نے تم کو عزت والی مسجد (مسجد الحرام) سے روکا تھا، تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔ دین الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انصاف کی روح زندہ رہے۔ اس کا مضاف الیہ خواہ کوئی ہو۔ اس بلند نشیمن پر فقط اکبر ہی بیٹھا ہے اور دار انصاف کی دار ہے۔ جہانگیر نے سونے کی زنجیر کیوں بندھوائی! اس کو تو عیاش سمجھا جاتا ہے۔ وہ اکبر کا بیٹا تھا جو انصاف کو عام کرنے آیا تھا۔

الغرض جب اکبر نے ملکی حکومت قائم کی اور بیرونی اسلامی دنیا سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا تو اب اس کے لیے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ مختلف مذاہب کو غیر معتبر قرار دے کر لادینیت

---

[1] حضرت مولانا سندھی نے راقم الحروف سے ایک دفعہ فرمایا۔ ۱۸۹۸ء میں نے سر سید احمد خاں کی روح پر ثواب بھیجنا بھی اپنا معمول بنا رکھا تھا۔

پر ساری مملکت کو جمع کیا جائے" جس کا تجربہ اب یورپ میں ہو رہا ہے۔ مگر اکبر نے یہ احتمال قریب بھی نہ پھٹکنے دیا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مختلف مذاہب کو تسلیم کر کے ہر ایک کو پوری آزادی دی جائے اور قانونِ حکومت کی جو شخص خلاف ورزی کرے، اس سے مواخذہ ہو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم۔ دوسرے لفظوں میں مذہب آزاد ہے، جب تک کہ حکومت سے اس کا تصادم نہ ہو۔ یہ اکبر کا بنایا ہوا قانون ہے، جس پر انگریز اب عمل کر رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو بڑا عالی دماغ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس ملک میں جو مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے، حکومت چلانے والے بادشاہ اور اس کی انتظامی کونسل کا کیا طرزِ عمل ہو گا؟ اس کے لیے اکبر نے دینِ الٰہی کا فقرہ ایجاد کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اور اس کی مرکزی کونسل کسی خاص مذہب کے طرفدار نہیں ہوں گے۔ مگر وہ مطلق مذہب کی پابندی سے بھی اپنے آپ کو آزاد نہیں کریں گے، اور لادینیت نہیں آنے پائے گی۔ یعنی وہ خدا کی حکومت تسلیم کریں گے۔ اب ایک ہندو اللہ کی حکومت کی تفسیر ایک طرح کرتا ہے۔ ایک سُنّی مسلمان دوسری طرح اور ایک شیعہ تیسری طرح۔ ان اختلافات سے حکومت کو تعرض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہو گا۔ البتہ پرائیویٹ طور پر بادشاہ اور ارکانِ کونسل اپنے اپنے مذہب کے پابند رہیں گے۔ اس یکسانی کو دینِ الٰہی سے تعبیر کیا گیا۔ اس وسیع مملکت کے لیے اس سے بہتر غیر اسلامی نظام ناممکن تھا۔

ہماری رائے میں جو کام اکبر نے شروع کیا، وہ اساساً صحیح تھا۔ عملاً اس میں غلطیاں اس لیے ہوئیں کہ اس عظیم الشان کام کو چلانے کے لئے اسے آدمی میسّر نہیں آئے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کوتاہی خدا تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کے ذریعے پوری کر دی۔ شاہ صاحب نے اس کام کو مکمل کر دیا، جو اکبر نے شروع کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اوّل تو اسلام کی اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ وہ انسانیت کا مصداق ہو جاتا ہے۔ پھر وہ مختلف ادیان کو آپس میں یوں مطابقت دیتے ہیں کہ

ان میں تناقض نہیں رہتا۔ اگر ہندوستانی شاہ صاحب کے طریقے کا عالم بننے کے بعد نظامِ سلطنت چلانے کا ارادہ کرے، تو اس کے مقابلے میں کوئی اجنبی حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی، خواہ وہ کافر ہو یا مسلم۔

شاہ صاحب کی حکمت پڑھنے کے بعد اگر کوئی شخص اسلامی ممالک کی سیر کرے تو اس کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ وہ ملک اپنا فقہی مذہب چلانے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن اگر مختلف مذاہب کو وہ اپنے یہاں اجازت دیں یا اجازت دینے پر مجبور کر دیئے جائیں تو سوائے لادینیت کے اور کوئی نظامِ حکومت ان کے یہاں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ترکی میں جا کر دیکھ لو۔ پھر دیکھو کہ کس طرح عرب ممالک اور افغانستان ترکی کا تتبع کر رہے ہیں۔ اب اسلامی ممالک کی یہ حالت ہے کہ وہاں یا اکبر کا دینِ الٰہی ہے یا لادینیت۔ اگر شاہ صاحب کی حکمت کا رواج ہوتا تو وہ ممالک اس مرض میں مبتلا نہ ہوتے۔

اکبر کے کارکنوں نے جو غلطیاں کیں اور جس طرح وہ اسلامی حدود سے باہر نکلے ان کی اصلاح کا ابتدائی کام حضرت امام ربّانی مجدّد الف ثانی نے شروع کیا اور وہ مجدّد مانے گئے مگر امام ربّانی نے فقط کام شروع کیا تھا۔ اس کی تکمیل محمد شاہ کے عہد میں شاہ ولی اللہ نے کی۔ شاہ صاحب کو کام کرنے کا اس وقت موقع ملا، جب دلی کی سلطنت اصلی معنوں میں مسلمانوں کے ہاتھ سے جا چکی تھی۔ اس لیے اس تعلیم کے نتائج اس وقت ظاہر نہ ہو سکے۔

الغرض اکبر کے کارکنوں کی بعض غلطیوں کی اصلاح کے سلسلے میں امام ربّانی نے جو کام شروع کیا تھا امام ولی اللہ نے اسے مکمل کر دیا۔ چنانچہ امام ربّانی کو شاہ صاحب اپنے طریق کا "ارہاص" مانتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ، سے استبعاداً ذکر کیا کہ شاہ صاحب حضرت مجدد کو ارہاص" کہتے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا۔ یہ بہت بڑی بات ہے، یعنی حضرت مجدّد بہت بڑی ہستی ہیں۔ اس لیے شاہ صاحب کا یہ لکھنا خود شاہ صاحب کے حق میں، یعنی ان کی عظمت ثابت کرنے کے لیے بہت بڑی چیز ہے۔ حضرت کا جواب میرے اس وہم کو دور کرنے

کے لیے تھا کہ شاہ صاحب نے مجدد صاحب کو "ارہاص" کہہ کر میرے نزدیک خلافِ معمول بات فرمائی تھی۔

حضرت شاہ صاحب مکتوبات میں فرماتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام پر ایک ہزار برس گزرنے کے بعد ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دَور میں بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مثلاً قلب و روح اور ان کے سِرّ کے احوال اجمالی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اور بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مفصل طور پر رونما ہوئے۔ مثلاً اس دور میں "الحجر بحت" اور "انانیت کبریٰ" کے مسائل پہلے دوروں کے مقابلے میں بڑی تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں۔ الغرض اس دور کے "ارہاص" شیخ مجدد ہیں۔ اس دور کے بہت سے مخصوص معارف شیخ موصوف نے رمز و ایما میں بیان فرمائے۔ وہ اس دَور کے قطب ارشاد ہیں اور ان کے مبارک ہاتھوں سے بہت سی گمراہیاں اور بدعتیں دُور ہوئیں۔ فقیر شیخ مجدد کے بہت سے معارف کا جو موصوف اس دَور کے فاتح کی حیثیت سے ارشاد فرما چکے ہیں، مصداق ہے"
(صفحہ ۹۰۸)

غرضیکہ امام ربانی شاہ ولی اللہ کے طریقے کے "ارہاص" ہیں اور اسی روشنی میں ہم امام ربّانی کے اس ارشاد کو حل کرتے ہیں۔ "مجھے ایک عظیم کارخانہ حوالے کیا گیا اور مجھے پیری و مریدی کے لیے نہیں متعین کیا گیا۔ میری تخلیق کا مقصد خلقت کی محض تکمیل و ارشاد نہیں بلکہ کوئی اور معاملہ مقصود ہے، اور کوئی دوسرا کارخانہ مطلوب" مکتوب (ششم دفتر دوم)۔ فسانہ طرازوں اور قصہ گو حضرات نے ان تصریحات کو دوسرے ادنیٰ محامل پر محمول کر لیا ہے۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

مذکورہ بالا عبارت صاف طور پر اس امر کی صراحت کرتی ہے کہ امام ربّانی اس دَور کے "ارہاص" ہیں۔ "تفہیمات الٰہیہ" میں بیان کیا گیا ہے کہ اس دَور کے قیّم امام ولی اللہ ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "ہم سے پہلے جو بزرگ گزرے ہیں، وہ وحدت الوجود کے سراغ میں بہت آگے بڑھ گئے اور ان کا

علم اس منزل پر پہنچا کہ سب کچھ اللہ ہی اللہ ہے۔ اس پر ملاء اعلیٰ میں وجود حقیقی اور مخلوقات میں جو اتحاد اور اختلاف ہے، اس کا علم متشکل ہوا۔ شیخ مجدد آئے اور اس علم کے اردگرد جو ملائکہ میں مقدر ہو چکا تھا، گھومتے رہے۔ کبھی تو انہوں نے یہ فرمایا کہ عالم موجود فی الخارج ہے۔ کبھی یہ فرمایا کہ عالم موہوم ہے۔ کبھی ارشاد کیا کہ عالم اسمائے الٰہی کا پرتو ہے لیکن اس مسئلے کی انہوں نے صراحت نہ فرمائی۔ آخر کار اس دور کا قیم آیا اور اس میں جو حقیقت تھی۔ وہ کھول کر بیان کردی ہے (صہ ۱۰۱ و صہ ۱۰۲)

شاہ ولی اللہ نے امام ربانی کے بعض بیانات کی، جن سے اغلاق کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں، اس طرح وضاحت بھی کی کہ امام ربانی کا حقیقی مقصود واشگاف ہو گیا۔ امام ربانی کے بعض اقوال پر عرب و ہندوستان میں بڑے اعتراض ہوئے تھے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "درجۂ خلّت" میرے ذریعہ نصیب ہوا۔ شاہ ولی اللہ اس کی توجیہ فرماتے ہیں کہ یہ بیان کی پیچیدگی، الفاظ کی کوتاہی اور عدم مساعدت ہے۔ ورنہ ان کا مطلب صحیح ہے اور اس میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کو فتح کیا اور یہاں اسلامی سلطنت قائم کی۔ گو رسول اللہ علیہ وسلم کے دین کا ممالک اور ادیان پر غلبہ آپؐ کے ذاتی کمالات میں داخل ہے، مگر ہندوستان پر غلبہ متحقق ہونے میں سلطان محمود واسطہ بنتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کمالات کی تشریح میں امام ربانی واسطہ بنے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ امام ربانی کے بیانات میں الفاظ کی ایک گونہ تنگی ہے۔ (تفصیل ملاحظہ ہو مکتوبات صفحہ ۹۰۸۔)

۲۹ سید احمد شہید کی تعلیم و تربیت :-

امام عبدالعزیز کے خواص اصحاب جن کے رگ و ریشہ میں حزب ولی اللہ کی خصوصیات سرایت کر چکی تھیں۔ اور ایک لمبے زمانے سے ان کی تربیت پر توجہ مرکوز رہی تھی۔ یہ شاہ عبدالعزیز کے تین بھائیوں کے علاوہ شاہ اسمٰعیل، مولانا عبدالحی، مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب تھے۔ امیر شہید

دراصل اس حزب میں سے نہیں تھے بلکہ بعد میں ان کے ساتھ منضم کیے گئے تھے۔ ان میں کشفی کمالات تھے۔ سپاہ گری کی تعلیم تھی۔ سیّد تھے۔ اس لیے ان کو امام عبدالعزیز نے امارتِ جہاد کے لیے موزوں قرار دیا۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں حزبِ مذکور کی راہ سے نہ ہٹ جائیں، اُن کے ساتھ دو وزیر اپنے مکمل تربیت یافتہ لگا دیے، مگر اپنا صحیح اور پورے معنوں میں جانشین حضرت شاہ محمد اسحاق کو مقرر کیا۔

سید احمد شہید صاحب کی تعلیم کے متعلق کہتے ہیں کہ جب وہ کتاب دیکھتے تھے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ غرض کتاب و سنت سے زائد چیز کے دیکھنے سے ان کی بصیرت روک دی گئی تھی۔ اس کا دراصل یہ مطلب تھا کہ شاہ ولی اللہ کے طریقے کا صاحبِ کشف اس سے زیادہ کتابی علوم کا محتاج نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک سیّد صاحب دینی علوم کی جس قدر کہ ایک امیر کے لیے ضروری ہے، تحصیل کر چکے تھے۔ ان کی نئی دینی تعلیم کشف سے ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں سیّد صاحب کو اُمّی ثابت کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ نیز یہ غلط ہے کہ شاہ محمد اسحاق کے اشارے پر مولانا عبدالحی ان سے ملے اور بیعت کی اور اس کے بعد مولانا عبدالحی کے کہنے پر مولانا اسمٰعیل نے بھی بیعت کر لی۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ پڑھنے سے امیر شہید کی طبیعت پر بوجھ پڑتا تھا اور کشفِ طبعی پر یہ چیز گراں گزرتی تھی۔ اس لیے ان کو علوم کے سماع کے لیے حکم دیا گیا۔ اس طرح ان کو جس قدر شرعی علوم کی ضرورت تھی، انہوں نے حاصل کر لیے۔ گو وہ تحصیل عالمانہ طریقے پر نہ تھی۔ ہمیں اس کا تجربہ سندھ کے اپنے بعض دوسرے مشائخ کے سلسلے میں ہوا ہے۔ وہ عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ قرآن شریف کا ترجمہ اور حدیث کی کتابیں وہ سنتے اور جو عالم انہیں سناتا، وہ ان سے بدرجہا زیادہ علم رکھتا تھا مگر جس وقت وہ کسی شرعی مسئلے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تحقیقاً جان لیتے تو جس طرح وہ اپنی جماعت میں انقلاب پیدا کر دیتے تھے، اس کا عشرِ عشیر بھی وہ عالم پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح پہ ہم سیّد احمد شہید صاحب کو ایک عالم مانتے ہیں۔ ان کے مناقب

لکھنے والے دھوکہ دیتے ہیں کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے بلکہ سب چیزیں کشف سے ان کو حاصل تھیں۔ ان لوگوں کی خواہش دراصل یہ ہے کہ سید صاحب کا جو تعلقِ تلمذ شاہ عبدالعزیز سے ہے، وہ کاٹ دیا جائے۔ اور وہ ایک امام مہدی کے طور پہ مانے جائیں۔ ان لوگوں نے اس تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

شاہ علم اللہ جن کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، ان کے فرزند سید محمد ضیاء اور ان کے بیٹے سید شاہ ابوسعید ہیں۔ آپ امیر شہید کے جد مادری اور امام ولی اللہ کے خلیفہ ہیں۔ سیرتِ احمدیہ صفحہ ۵۶ میں ہے۔ اس خاندان کے بہت سے بزرگوں نے شاہ ولی اللہ اور آپ کے صاحبزادوں سے ظاہری اور باطنی استفادہ کیا۔ شاہ ابوسعید، شاہ محمد واضح، سید محمد معین، سید محمد لقمان، عمِ امیر شہید نے شاہ ولی اللہ سے اور سید قطب الہدیٰ، سید محمد اسحاق برادر اکبر امیر شہید نے شاہ عبدالعزیز سے اور شاہ عبدالقادر سے استفادہ کیا۔ اس طرح اس خاندان میں حضرت مجدد سرہندی اور مجدد دہلوی کی برکتیں جمع ہو گئیں۔ یہ خاندان اپنا خصوصی مشرب اور مخصوص فکر رکھتا ہے۔ یہ خصوصیت امیر شہید کے خاندان میں حضرت مجدد کے خلیفہ شیخ آدم بنوری سے متوارث چلی آتی ہے۔ بنابریں سید امیر شہید کا حزب ولی اللہ کے رنگ میں پورے طور سے رنگا جانا بعید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں موقع ملا تو انہوں نے اپنے امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا اور تحریک ناکام رہ گئی۔

مشرقی مغربی ہند کی رقابت تاریخ میں قدیم سے چلی آتی ہے۔ چندر بنسی سورج بنسی خاندان اسی مغربیت و مشرقیت کے دوسرے عنوان ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ رقابت مذکورہ بعد از اسلام بھی قائم رہی اور امیر شہید کے وقت بھی وہ بروئے کار آئی۔ امیر شہید مشرقی ہند رائے بریلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے عام مریدین بھی بہار وغیرہ کے تھے۔ اس کے بالمقابل مغرب یعنی دہلی ہے۔ یہ لوگ دہلی تحریک کو اپنانا چاہتے تھے۔ اسی لئے مولانا ولایت علی بہاری نے مولانا محمد اسحٰق کے خلاف دوسری جماعت تیار کی۔ وہ مولانا محمد اسحٰق اور حزب دہلوی کو اس میدان سے دور ہٹانا چاہتے تھے۔

۱ ہیئتِ اجتماعیہ کے مدارج :۔

ایک شخص اپنے طبعی جذبات اور علوم کے متعلق اپنی ضروریات لور جسمانی حاجتیں تنہا کبھی پوری نہیں کر سکتا۔ جس جماعت میں یہ صلاحیت ہو کہ اس کا ہر فرد اپنی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے، اس کو ہیئت اجتماعیہ کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ اس ہیئت اجتماعیہ کو قائم رکھنے کے لیے یہی لوگ اپنی حکومت بنا لیتے ہیں۔ حکومت بن جانے کے بعد افراد کی بغاوت ہیئت اجتماعیہ کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ اچھی حکومت پیدا کر لینا ہیئت اجتماعیہ کے بعد انسانیت کی ترقی کا دوسرا قدم ہے۔ جس جگہ یہ دونوں چیزیں مجتمع ہوں، وہ مدینہ تامہ ہے۔ جہاں فقط ہیئتِ اجتماعیہ ہو اور منظم حکومت نہ ہو، اس کو مدینہ ناقصہ کہتے ہیں اور آج کل کی اصطلاح میں اسے سوسائٹی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

انارکسٹ سوسائٹی کو مانتے ہیں اور اسی پر انسانی ترقی کو ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سوسائٹی ہی اپنے اوپر خود حکومت کر سکتی ہے "مدن ناقصہ" شاہ صاحب کے نزدیک مذکورہ بالا ہیئت اجتماعیہ کا ایک عنوان ہے۔ چھوٹے گاؤں میں تو ہیئت اجتماعیہ ہی حاکم ہوتی ہے۔ جیسے ایک بڑے گاؤں میں ہیئت اجتماعیہ حاکم ہے، اسی طرح بعض بڑے گاؤں ہوتے ہیں، جن میں کئی کئی آدمی نمبردار اور چودھری ہیں۔ اصلی طریقے کے مطابق وہاں ایک چھوٹی سی حکومت ہونی چاہیے مگر بعض اوقات حکومت کے بغیر بھی وہ لوگ اپنے توافق سے کام چلا لیتے ہیں۔ پرانے راجپوتوں اور آج کے افغانوں میں پنچایت اور جرگے کی رسم اسی توافق کی مثالیں ہیں۔

بعض بڑے شہر ہیں، جہاں حکومت کے بغیر کوئی کام چل ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ وہاں کی عقلمند اور نمایاں شخصیتیں سب ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔ عموماً اس اجتماع کا محل کوئی مقدس مقام ہوتا ہے۔ بحث کرنے کے بعد وہ ایک رائے قائم کر کے اٹھتی ہیں۔ یہ پارلیمنٹ ہے اور ہماری زبان میں اس کا نام اہل حل و عقد ہے۔ ہمارے ہاں کے متاخرین بادشاہوں نے اہل حل و عقد کی قوت کو برباد کر کے اپنی شخصیت کو نمایاں کیا اور اس طرح خود برباد ہو گئے۔ جب تک صالح بادشاہ

رہے، جن میں کہ بادشاہی چلانے کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ تو وہ اہل حل وعقد کے مشوروں کے پابند رہتے تھے۔ ہمارے خیال میں یورپ نے پارلیمنٹری نظام کی کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی بلکہ وہ اسی نظام کا منضبط طریقہ ہے۔ ہمارے یہاں یہ چیز منضبط نہیں تھی۔

دو آدمی مساوی درجے کے مل کر حکومت کرتے ہیں۔ جب وہ کسی مشورے میں مل بیٹھتے ہیں، تو جیسے سفر کے رفیق ایک شخص کو وقتی طور پر امیر بنا لیتے ہیں، اسی طرح اس اجلاس میں ایک وقتی امیر بنا لیا جاتا ہے اور باہم اتفاق سے کام چلتا رہتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں بڑے شہروں اور ملکوں میں ملتی ہیں۔ یہ انسانیت کے طبعی تقاضوں میں سے ایک شق ہے۔ یعنی کبھی وہ ایسا بھی کر لیتے ہیں۔ جمعیۃ مرکزیہ میں عموماً بورڈ کی روح کام کرتی ہے۔ کیونکہ وہاں سب یکساں ہوتے ہیں، کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔

۳۱ سکھ :-

۱۷۶۳ء کے دوران میں سکھوں نے پنجاب میں بہت زیادہ ادھم مچایا اور دہلی پر آفت لانے کا ارادہ کیا، مگر اس وقت پھر شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کی امداد کی۔ سکھوں نے سارے ملک میں غدر مچا رکھا تھا۔ اپریل ۱۷۶۷ء میں وہ لاہور آیا۔ سکھ بھاگ کر پہاڑوں میں چلے گئے۔ آلا جاٹ نے سرہند میں دو لاکھ فوج جمع کر رکھی تھی۔ شاہ ابدالی نے نوّے کوس دو روز میں طے کر کے اس پر حملہ کیا اور شکست دی، جس میں سکھوں کے بیس ہزار آدمی قتل ہوئے۔ اس کے بعد وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا۔ (تاریخ ذکاء اللہ $\frac{۳۱۸}{۹}$)

حضرت مولانا شاہ عبد العزیز کے یہ اشعار، جو آپ نے اپنے چچا شاہ اہل اللہ کے نام لکھ کر روانہ کئے، سکھوں کے پیدا کردہ اضطراب کا صحیح نقشہ پیش کرتے ہیں۔

جَزَی اللّٰہُ عَنَّا قَوْمَ سکھ ومرھٹہ　　عُقُوبَةَ شَرٍّ عَاجِلاً غَیْرَ آجِلِ !!
وَقَدْ قَتَلُوْا جَمْعًا کَثِیْرًا مِنَ الوَرٰی　　وَقَدْ اَدْرَجُوْا فِی اَھْلِ شَاہٍ وَجَاہِلِ
لَھُمْ عَسْکَرٌ عَامٌ نُصَیْبَةٌ فِی بِلَادِنَا　　یَجُوْسُوْنَ فِیْنَا بِالضُّحٰی وَالاَصَائِلِ

فَهَل هٰهُنَا مِن مَعَاذٍ بِحَائِذٍ؟
وَهَل مِن مُغِيثٍ يَتَّقِي اللهَ عَادِلٍ

اللہ سکھ اور مرہٹہ قوم کو ہمارے بدلے میں سخت سزا دے، جلدی اور اس میں تاخیر نہ کرے۔

انہوں نے مخلوق میں سے ایک کثیر تعداد کو قتل کیا ہے۔ اور ہر کس و ناکس کو اذیتیں دی ہیں۔

وہ ہر سال ہمارے علاقوں پہ لوٹ مار کرنے چڑھ دوڑتے ہیں۔ اور صبح و شام کوئی وقت ہو، ہم پر دھاوا بول دیتے ہیں۔

کیا یہاں کسی پناہ مانگنے والے کے لئے کوئی پناہ ہے۔ اور کیا کوئی اللہ سے ڈرنے والا عادل مددگار ہے۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

أَيَّامُ بَرْدٍ أَتَتْ ذَا الْقَلْبُ مُنْجَزِعٌ　　مِنْ قَوْمِ سِكْهٍ إِنَّ الْخَوْفَ مَعْقُولٌ
أَلْقَاهُمُ اللهُ مِن هٰذِهِ الدِّيَارِ فَهُمْ　　شَرُّ الْأَعَادِي وَهُمْ مِنْ جِنَّةٍ غُولٌ
فَوَّضْتُ أَمْرِي وَأَمْرَ النَّاسِ كُلِّهِمْ
إِلَى الْإِلٰهِ وَإِنَّ الْحِفْظَ مَأْمُولٌ

جاڑے کے دن آگئے اور دل سکھ قوم کی وجہ سے غم زدہ ہے اور ایسا ہونا بالکل ٹھیک ہے۔

اللہ انہیں اس سرزمین سے دفع کرے۔ وہ بدترین دشمن ہیں۔ اور غارتگر جن ہیں۔

میں نے اپنا اور سب لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ اور اسی سے حفاظت کی امید ہے۔

۳۲ مولانا محمد یعقوب دہلوی

آپ شاہ محمد اسحاق کے بھائی ہیں۔ آپ کا سن پیدائش ۱۲۰۰ھ ہے۔ امام ولی اللہ کو شاہ محمد اسحاق اور شاہ یعقوب کی ولادت اور حجاز کی طرف ہجرت کرنے کی بشارت دی گئی تھی۔ شیخ محمد عاشق "قول جلی" میں لکھتے ہیں۔ کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے فرمایا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ "یہ سب کے سب فرزند جو لطف الٰہی سے مجھے عطا ہوئے ہیں۔ نیک بخت ہیں اور ان میں پاک بازی اور نیکی ظہور پذیر ہوگی۔ لیکن تدبیر غیبی کا تقاضا یہ ہے کہ دو شخص اور پیدا ہوں گے جو مدتوں مکہ اور مدینہ میں دینی علوم کو ترویج کریں گے، اور وہیں سکونت پذیر ہو جائیں گے۔ یہ اپنی ماں کے رشتے سے مجھ سے متعلق ہوں گے۔ گو آدمی کو فطرتاً اپنے وطن مادری سے محبت ہوتی ہے۔ اور جہاں والدہ متوطن ہوا سے چھوڑنا بڑا گراں گزرتا ہے۔ لیکن بدرجۂ مجبوری یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔"

نواب صدیق حسن خاں "قول جلی" کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کی اس عبارت کے مصداق شاہ عبدالعزیز کے دونوں نواسے مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب ہی ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں نے دہلی سے ہجرت کی — مکہ میں اقامت پذیر ہوئے۔ وہاں سالہا سال تک علم حدیث کا درس دیا۔ اور عرب و عجم ان سے فیض یاب ہوئے۔

میرے (مولانا سندھی) نزدیک "احیائے علوم" سے مراد صرف حدیث کی روایت نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ یہ دونوں بزرگ آخر تک امر بالمعروف و نہی عن المنکر، دعوت جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف کار رہے اور یہی مقصد ہے احیائے علوم کا۔ شیخ محمد یعقوب نے اپنے نانا امام عبدالعزیز اور ان کے گرامی قدر ساتھیوں اور خاص طور پر شاہ محمد اسحاق سے علم حاصل کیا تھا۔ آگے چل کر موصوف سے شیخ مظفر حسین کاندھلوی، امیر امداد اللہ، شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نے جو دیوبندی جماعت کے اساطین تھے، اکتساب علم کیا۔ شیخ محمد یعقوب کا انتقال ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا اور مدرسہ دیوبند کی بنیاد ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ میں پڑی۔ اس دن سے حزب

دہلوی کا نام دیوبندی جماعت مشہور ہوا (التمہید ص۲۱۵)

امام عبدالعزیز کے انتقال کے بعد حزب دہلوی کی امارت مولانا محمد اسحاق کے سپرد ہوئی۔ ۱۲۶۳ھ میں موصوف کا انتقال ہوا تو مولانا محمد یعقوب دہلوی ان کے جانشین ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے۔

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمعیل و اسحاق۔ "خدا کا شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمعیل اور اسحاق عطا فرمائے"۔

۱۲۶۷ھ مولانا مملوک علی:-

مولانا مملوک علی کے آباؤ اجداد میں سے ایک شیخ محمد ہاشم ہیں، جن کا سلسلۂ نسب قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق رضؓ سے ملتا ہے۔ شاہجہاں نے آپ کو قصبۂ نانوتہ میں جاگیر دی تھی۔ یہ لوگ وہیں بس گئے۔ ان کی اولاد سے بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے جو حزب دہلوی کے نامی گرامی ارکان تھے۔

ان میں ایک مولانا استادِ عصر مملوک علی بن احمد بن علی بن غلام شرف بن عبداللہ بن فتح بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن شیخ محمد ہاشم ہیں۔ شیخ موصوف شیخ رشید الدین کے شاگرد ہیں آپ عربی فقہ اور دوسرے علوم و فنون میں اپنے زمانے کے علماء سے ممتاز اور فائق تھے۔ دہلی کالج میں اپنے استاد مولانا رشید الدین کے بعد ان کو مدرسی کا منصب سپرد کیا گیا۔ ان کے شاگردوں میں سے مولانا محمد مظہر نانوتوی، شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، عبدالرحمٰن پانی پتی، احمد علی سہارنپوری کا مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ محمد یعقوب ابن مملوک علی اور ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ تھے۔ سید احمد دہلوی بانی جامعہ علی گڑھ، نذیر احمد مترجم قرآن اور مولوی ذکاء اللہ اور دوسرے نامور اہلِ علم کو بھی ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

سرسید اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں۔

"جناب مولوی مملوک علی شاگرد مولوی رشید الدین خاں علم معقول و منقول میں استعدادِ کامل اور کتبِ درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے

قرآن کے لوحِ حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔ چودہ پندرہ سال سے مدرسہ شاہجہاں آباد میں عہدۂ مدرسی رکھتے تھے۔ لیکن اب کئی سال سے سرکردہ مدرسین ہیں"

مولانا مملوک علی نے ۱۲۶۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کو مقبرہ امام ولی اللہ دہلوی میں دفن کیا گیا۔ آپ کے صاحبزادے شیخ محمد یعقوب مدرسۂ دیوبند کے رئیس المدرسین مقرر ہوئے تھے اور ان ہی سے ہمارے استاد شیخ الہند نے علم حاصل کیا۔ (التمہید)

مولانا مملوک علی سرکاری مدرسے کے ملازم تھے۔ ان کی نگرانی میں حزب دہلوی کا کام شبہات سے بالا رہ کر چل سکتا تھا، ورنہ ریزیڈنٹ کی نظر نہایت تیز تھی، مگر مولانا مملوک علی کو آزاد ساتھی چاہئیں۔ امیر امداد اللہ شاہ اسحاق کے مدرسے کے پرانے طالب علم اور ان کے داماد مولوی نصیر الدین کے شاگرد تھے۔ موصوف کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی۔ وہ امیر شہید سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ سید صاحب شہید کا نمونہ تھے۔ مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی ان کے ساتھ اس طرح کام کرتے رہے جیسے امیر شہید کے ساتھ مولانا عبد الحی اور مولانا اسماعیل تھے۔

۳۴ مولانا قطب الدین دہلویؒ

آپ شاہ محمد اسحاق صاحب کے خلیفہ ہیں۔ موصوف نے شرح المشکوٰۃ لکھی جس سے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اس کے علاوہ آپ کی اور کتابیں بھی ہیں۔ مولانا قطب الدین شاہ محمد اسحاق کے مخصوص اصحاب میں سے تھے۔ موصوف نے ۱۲۸۹ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا۔

۳۵ مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ

آپ بڑے پرہیزگار، خدا ترس، نیکیوں کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے تھے۔ موصوف نے اپنے چچا مفتی الٰہی بخش اور مولانا اسحاق سے پڑھا اور مولانا محمد یعقوب دہلوی کی صحبت میں فیض رشد پایا۔ آپ مولانا محمد اسحاق کے حجاز تشریف لے جانے کے بعد ہندوستان میں

آپ کے نائب تھے۔ آپ ہی ہیں، جنہوں نے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم دیوبندی کو منبر وعظ پر بٹھایا۔ مولانا موصوف کا ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ میں انتقال ہوا اور بقیع میں دفن ہوئے (التمہید)

ت ۳۶ تاسیس مدرسہ دیوبند .

حزب ولی اللہ کے مشائخ نے جو ۱۸۵۷ء اور اس سے پہلے ہجرت کرکے حجاز تشریف لے گئے تھے، فیصلہ کیا کہ مدرسہ دہلی کے نمونے پر دینی علوم کے لئے ایک درس گاہ قائم کی جائے۔ مدرسہ دہلی امام عبدالعزیز کے زمانے میں بنا تھا اور اس کے اساتذہ میں سے مولانا عبدالحی دہلوی، پھر رشیدالدین دہلوی اور ان کے بعد مولانا مملوک علی دہلوی تھے۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء یعنی ۱۲۷۴ھ کے ہنگامہ میں بند ہو گیا تھا۔

امیر امداد اللہ، امام عبدالغنی دہلوی اور حزب دہلوی کے دوسرے مشائخ چاہتے تھے کہ حجاز میں ہندوستان کے اسلامی مرکز کو مضبوط بنائیں اور سرحد کے پہاڑوں میں ہندوستانی تحریک کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے کوئی اقدام کریں۔ ہندوستان میں امیر امداد اللہ کے نائب شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا: "اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان (ترجمان) عطا فرماتے ہیں، چنانچہ شمس تبریزی کے واسطے مولانا رومی کو لسان بنایا اور مجھ کو مولانا محمد قاسم لسان عطا ہوئے، جو میرے قلب میں آتا ہے، مولانا اس کو بیان کر دیتے ہیں۔" مولانا حسین احمد مدنی نے ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ فرماتے تھے "مولانا محمود حسن کو کم نہ سمجھو۔ وہ اپنے زمانے کا شیخ ہوگا۔" (تمہید)

ت ۳۷ مولانا امداد اللہ .

آپ بہت بڑے عارف، شریعت اور طریقت کے جامع اور اعلاء کلمۃ الحق کے لیے جہاد کرنے والے تھے۔ امیر امداد اللہ فاروقی ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۲۳۳ھ بمقام نانوتہ ہوئی۔ آپ۔

شیخ محمد قلندر، شیخ الٰہی بخش کاندھلوی اور شیخ نصیر الدین دہلوی سے پڑھا۔ جب بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد شہید شہادت پا گئے تو جماعت کے باقی ماندہ لوگوں نے مولانا نصیر الدین دہلوی کی بیعت کر لی۔ اس موقع پر امیر امداد اللہ نے سب سے پہلے ان کی بیعت کی تھی۔ ۱۲۶۱ھ میں امیر امداد اللہ حرمین گئے۔ یہاں مولانا محمد اسحاق صاحب سے ملے اور ان سے دعوت و ارشاد کا طریقہ اخذ کیا۔ بعد ازاں ۱۲۶۲ھ میں آپ پھر ہندوستان چلے آئے۔ امیر امداد اللہ صاحب کا اصل نام امداد حسین تھا، جسے مولانا اسحاق صاحب نے بدل کر امداد اللہ کر دیا۔ حاجی امیر امداد اللہ صاحب کی ذات مرجعِ خلائق تھی اور آپ سے بے شمار اہلِ فن نے فیض پایا۔ ان میں سے مشہور مولانا محمد قاسم، رشید احمد، شیخ فیض الحسن سہارنپوری اور دوسرے نامی گرامی علمائے ہند ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ معرکہ شاملی کے امیر تھے۔ اس کے بعد موصوف چھپ کر حجاز پہنچ گئے اور مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ دیوبندی جماعت کے امیر تھے۔ آپ نے ۱۳۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔ (”تمہید“)

۳۸ مولانا محمد قاسم

ابو ہاشم محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد علاؤ الدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبد السمیع بن محمد ہاشم نانوتوی۔ آپ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ موصوف نے اپنے چچا مولانا مملوک علی سے اور ان کے علاوہ مولانا عبد الغنی، مولانا احمد علی اور حاجی امداد اللہ وغیرہم سے اکتسابِ علم کیا۔ ۱۲۸۲ھ میں آپ کے ہاتھوں دار العلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔ اس کے کہیں نو برس بعد ۱۲۹۲ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج بنا تھا۔ مولانا محمد قاسم چودہویں صدی ہجری کے مجددین میں سے تھے۔ آپ نے ولی اللّٰہی حکمت و معارف کو اہلِ ہند کے لیے زمانۂ حاضر کے لباس میں پیش کیا۔ موصوف سے بے شمار لوگوں نے فیضِ علم پایا تھا اور ان میں سے ایک ہمارے استاد حضرت شیخ الہند ہیں جو آگے چل کر دیوبندی تحریک کے تیسرے دور کے امام اور پیشوا بنے۔ مولانا محمد قاسم کی دعوت کا سارا انحصار امراء اور اصحابِ ثروت کے بجائے اللہ تعالیٰ کے بھروسے سے تلت

کے غریب طبقوں پر تھا۔ چنانچہ دیوبندی تحریک حتی الوسع طبقۂ امراء کے ساتھ خلط ملط کرنے سے بچتی تھی۔ مولانا محمد قاسم نے ۱۲۹۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی شخصیت مولانا اسماعیل شہید سے بہت مشابہ تھی۔

۳۹۔ مولانا رشید احمد گنگوہی:

شیخ الاسلام ابومسعود رشید احمد گنگوہی ہدایت اللہ انصاری کے صاحبزادے ہیں آپ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اور مولانا مملوک علی، مولانا عبدالغنی، مولانا احمد سعید اور مولانا امداد اللہ وغیرہ سے آپ نے تعلیم پائی۔ خود میں (مولانا سندھی) نے موصوف سے سنن ابوداؤد کا ایک بڑا حصہ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بڑا نفع دیا۔ مولانا رشید احمد کی صحبت کا اثر ہے کہ میں ان کے مسلک پہ اس طرح کاربند ہوا کہ مجھے اس سے ہٹنے کا کبھی خیال نہیں ہوا۔ ان کی بدولت فقہ اور حدیث کے معاملے میں ولی اللہی طریقہ میرے سامنے واشگاف ہو گیا اور میں ان کی برکت سے فقہ، سلوک، معرفت، عربی زبان اور کتاب و سنت کے علوم میں اصول و معقول کو خوب جان گیا۔ میں نے مولانا رشید احمد کو فقہ حنفی کا ایک راسخ القدم امام و مجتہد پایا۔ آپ اپنے استاد مولانا عبدالغنی کے طریقۂ فکر کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ اور اس راہ میں پہاڑ کی طرح غیر متزلزل تھے۔ آپ ولی اللہی مسلک میں مولانا محمد اسحاق سے بہت مشابہ ہیں۔ میں آپ کی کتاب "براہین قاطعہ" سے سنت اور بدعت کی حقیقت سمجھا۔ یہ کتاب موصوف نے شاہ اسمٰعیل شہید کی تصنیف "ایضاح الحق" کی حمایت میں لکھی تھی۔ مولانا رشید احمد، امیر امداد اللہ اور مولانا قاسم کے بعد دیوبندی جماعت کے امام ہوئے۔ آپ سے تین سو سے زیادہ مشائخ نے دینی علوم حاصل کئے۔ آپ کا سن وفات ۱۳۲۳ھ ہے۔

۴۰۔ حزب صادق پوری:-

بالاکوٹ کے حادثہ کے بعد باقی ماندہ مجاہدین نے امیر نصیر الدین دہلوی کے ہاتھ پر جو مولانا

محمد اسحاق کے داماد تھے، بیعت کی تھی۔ لیکن بعد میں ان کی جماعت میں اختلاف رونما ہوا۔ بات یہ تھی کہ مجاہدین کو امیر شہید کا جنازہ نہ ملا تھا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے ان کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ جو بیشتر اربابِ حل و عقد پر مشتمل تھا امیر شہید کی شہادت کا قائل تھا۔ لیکن دوسرا گروہ جو تعداد میں کم تھا، امیر شہید کی موت کا انکار کرتا تھا۔ ان لوگوں نے بڑی مستعدی سے اس امر کی دعوت دینا شروع کی کہ امیر شہید زندہ ہیں، وہ شہید نہیں ہوئے اور عنقریب لوٹ کر آئیں گے۔ امیر شہید کے متعلق یہ دو خیال بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد ہی پیدا ہو گئے تھے۔ طبعاً ان کا اثر ہندوستان میں مددگاروں کی جو جماعتیں تھیں، ان پر بھی پڑا۔ مولانا محمد اسحاق اور ان کی جماعت امیر شہید کی شہادت کو تسلیم کرتی تھی، لیکن اس کے برعکس مولانا ولایت علی عظیم آبادی (صادق پوری) کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ شہید نہیں ہوتے بلکہ کہیں غائب ہو گئے ہیں۔

مولانا ولایت علی شاہ اسمعیل شہید کے خواص اصحاب میں سے تھے، اور سید احمد شہید آپ کو دعوت جہاد کے سلسلے میں ہندوستان بھیجا کرتے تھے۔ جب بالاکوٹ کا معرکہ ہوا تو مولانا ولایت علی وہاں موجود نہ تھے، اس لیے انہیں یقین تھا کہ سید احمد شہید کی شہادت نہیں ہوئی۔ یہ وجہ تھی جس کی بنا پر دونوں گروہوں میں اختلاف واقع ہوا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام دشمن جماعتیں تو مسلمانوں کا مذاق اڑاتیں اور کفار تھے کہ بلادِ اسلامیہ پر قبضہ کرتے چلے جاتے تھے۔ جہاں تک شاہ محمد اسحاق کے بس میں تھا، وہ اور ان کی جماعت اپنے کام میں لگی رہی۔ لیکن تمام کوششوں کے باوجود دونوں گروہوں کا اختلاف کم نہ ہو سکا۔ آخر کار شاہ محمد اسحاق ہجرت کر کے حجاز چلے گئے اور مکہ میں ۱۲۶۲ھ میں آپ نے انتقال کیا۔ مولانا محمد اسحاق کی وفات کے بعد حزب ولی اللہ دو مستقل جماعتوں میں بٹ گئی۔ ایک جماعت حزبِ دہلوی کہلائی۔ اور دوسری صادق پوری تھی۔

امیر ولایت علی کی جماعت میں عام طور پر بہار اور بنگال والوں کی کثرت تھی۔ آپ نے از سر نو بیعتِ جہاد کی دعوت دینی شروع کی اور اپنے آپ کو امیر شہید کا نائب قرار دیا۔ یہ ۱۲۴۸ھ کا واقعہ ہے۔ مولانا ولایت علی کی جماعت کا مرکز صادق پور (پٹنہ) تھا، اس لیے اس جماعت کا

نام حزب صادق پور پڑا۔ مولانا ولایت علی کے ساتھ مولانا عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی بھی شریک ہوگئے۔ یہ موصوف شاہ اسمٰعیل شہید سے خاص تعلق رکھتے تھے اور آپ نے امام شوکانی سے بھی پڑھا تھا۔ ان لوگوں نے حزبِ صادق پوری کی تنظیم کا باقاعدہ کام کرنا شروع کر دیا۔ البتہ شاہ محمد اسحاق کے احترام کے پیشِ نظر یہ دہلی اور اطراف دہلی میں اپنی جماعت کا کھلم کھلا پروپیگنڈا نہ کرتے۔

امیر ولایت علی ۱۲۵۰ھ میں حجاز گئے۔ وہاں سے یمن پہنچے اور امام شوکانی سے استفادہ کیا۔

مولانا محمد اسحاق ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تو امیر ولایت علی نے ۱۲۵۸ھ میں اپنے بھائی عنایت علی کو سرحد پار بونیر کے مقام پر بھیجا، جہاں امیر شہید کے باقی ماندہ مجاہدین ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ۱۲۶۲ھ میں جب مولانا محمد اسحاق کا انتقال ہوا تو امیر ولایت علی خود بھی بونیر پہنچ گئے اور وہاں ایک حد تک ان کو کامیابی بھی ہوئی۔ ۱۲۶۹ھ میں امیر ولایت علی فوت ہوئے اور ان کی جگہ ان کے بھائی عنایت علی امیر بنے، مجاہدین کی یہ جماعت امیر شہید کا برابر انتظار کرتی رہی۔ اس اثناء میں ان کا جہاد شروع کرنے پر اتفاق نہ ہو سکا۔

دراصل حزب صادق پوری کا اساسی عقیدہ یہ تھا کہ امیر شہید غائب ہو گئے ہیں اور وہ ضرور لوٹیں گے۔ یہی سبب تھا کہ جب مسلمانوں کے اور امراء اور سلاطین کفار کے خلاف لڑنے کے لیے اٹھے تو حزب صادق پوری ان سے بے تعلق رہی۔ کیونکہ امیر شہید کے ظہور سے پہلے ان کے نزدیک کفار سے جہاد کیسے ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود امیر عنایت علی کی جماعت میں ایسے مجاہدین بھی تھے، جو اس خیال سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس معاملہ میں ان کا میلان طبع حزب دہلوی کی طرف تھا۔

حزب صادق پوری کے اکابر ائمہ میں سے ایک شیخ الاسلام سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی ہیں۔ آپ ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۷ھ تک صادق پور ہی میں تعلیم حاصل کرتے رہے ۱۲۴۳ھ میں آپ دہلی آئے اور مولانا اسحاق سے پڑھا۔ آپ نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ اور آپ کی ذات علوم نقلی، علوم عقلی اور ادبیات سب کی جامع تھی۔ آپ اپنے استاد مولانا محمد اسحاق کے

تتبع میں حنفی فقہ کے مطابق فتوے دیتے تھے۔ فتاویٰ عالمگیری پر آپ کی اتنی نظر تھی کہ گویا آپ کو یہ ازبر یاد تھے۔ دراصل مولانا نذیر حسین کا رجحان حزبِ صادق پوری کی طرف بہت کم تھا۔ سنہ ۱۲۷۰ھ کے بعد آپ مستقل طور پر خود اجتہاد فرماتے اور اکثر معاملات میں شاہ اسمٰعیل شہید کا تتبع کرتے۔

حزبِ صادق پوری میں سے ایک نواب صدیق حسن خاں ہیں۔ موصوف امیر ولایت علی سے ملے تھے۔ اور شیخ عبدالحق بنارسی سے آپ کو تلمذ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ علمائے یمن سے بھی آپ نے استفادہ کیا اور خاص طور پر امام شوکانی سے موصوف کو بڑا شغف تھا۔ ("التمہید" صفحہ ۱۴۴)

علاوہ ازیں حزب دہلوی اور حزبِ صادق پوری کے متعلق "التمہید صفحہ ۱۴۸ میں لکھا ہے۔

حزب دہلوی کا شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا محمد اسحاق کی طرف میلان تھا۔ ان کے مقابلے میں حزب صادق پوری سید احمد شہید کی طرف زیادہ میلان رکھتی تھی، لیکن دونوں کی دونوں جماعتیں امام ولی اللہ اور ان کے بعد امام عبدالعزیز اور ان کے بعد سید احمد شہید کے ماننے میں متفق تھیں۔ بعد میں حزبِ صادق پوری کا میل جول "ظاہریہ" محدثین یمن کے زیدیوں اور نجد کے حنبلیوں سے بڑھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ شاہ اسمٰعیل شہید کے مسلک سے الگ ہو گئے اور دونوں جماعتوں کے علوم و معارف میں بھی بڑا اختلاف پیدا ہو گیا۔

اگر شاہ اسمٰعیل کی "تقویۃ الایمان" اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی "کتاب التوحید" کو غور سے پڑھئے تو شرک کی عدم مغفرت اور توسل فی الدعا کے معاملے میں دونوں میں جو فرق ہے، صاف نظر آئے گا۔ اسی طرح اگر شاہ اسمٰعیل شہید کی "اصولِ فقہ" اور امام شوکانی کی "ارشاد الفحول" دیکھئے تو اجماع کے مسئلے میں دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیز اگر شاہ شہید کی کتاب "العبقات" پڑھئے تو ابن عربی کے فلسفہ کے متعلق ان کی رائے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے حنبلی پیروؤں سے بالکل الگ ہے۔ چنانچہ مولانا نذیر حسین دہلوی ابن عربی کو کافر قرار نہ دینے کے معاملے میں شاہ اسمٰعیل شہید کے متبع تھے۔ کتاب "الحیات بعد الممات" میں لکھا ہے۔ میاں صاحب طبقۂ علمائے کرام

ہیں شیخ محی الدین ابن عربی کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور انہیں "ختم الولایۃ محمدیہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ مولانا بشیر الدین قنوجی، جو شیخ اکبر کے مخالف تھے ایک مرتبہ دہلی اسی غرض سے تشریف لائے کہ ان کے بارے میں میاں صاحب سے مناظرہ کریں۔ دو مہینے دہلی میں رہے، روزانہ مجلسِ مناظرہ گرم ہوتی، مگر میاں صاحب اپنی عقیدتِ سابقہ سے جو شیخ اکبر سے تھی، ایک تل برابر بھی پیچھے نہ ہٹے۔ آخر مولانا ممدوح دو ماہ کے بعد واپس تشریف لے گئے۔ علیٰ ہذا القیاس مولانا ابو مجیب شمس الحق نے بھی شیخ اکبر کے متعلق کئی دن تک متواتر میاں صاحب سے بحث کی اور "فصوص الحکم" پر اعتراضات کیے۔ میاں صاحب نے پہلے تو سمجھایا مگر جب دیکھا کہ ابھی "لا نسلم" ہی کے کوچے میں ہیں، تو فرمایا کہ "فتوحاتِ مکیہ" شیخ اکبر کی آخری تصنیف ہے اور اس لیے ان کی سب تصانیف ماسبق کی ناسخ ہے۔ اس جملہ پر وہ سمجھ گئے۔ (یہ بیان یہاں ختم ہوا۔)

نواب صدیق حسن خاں نے بھی اپنی کتاب "التاج المکلل" میں ابن عربی کی عدمِ تکفیر کی رائے دی ہے۔ لکھتے ہیں: ابن عربی کے معاملے میں صحیح نقطۂ نظر وہی ہے، جس پر محقق علماء جو علم و عمل اور شرع و سلوک دونوں کے جامع ہیں، عامل ہیں۔ وہ یہ کہ ان کے مسلک کے متعلق سکوت اختیار کیا جائے۔ ان کے ہاں جو باتیں بظاہر شریعت کے خلاف ہیں، ان کی اچھی تعبیر کی جائے اور ان کی تکفیر سے زبان کو روکا جائے۔ ان کے علاوہ اور جو مشائخ گزرے ہیں، جن کا تقویٰ سب کے نزدیک مسلم تھا، ان کے علم و فضل کو سب مسلمان مانتے تھے اور عملِ صالح میں وہ بلند مقام رکھتے تھے، ان کے معاملے میں بھی یہ مسلک اختیار کرنا چاہیئے۔

۱۲۔ مولانا احمد علی سہارنپوری:۔

آپ کے والد کا نام لطف اللہ انصاری تھا۔ موصوف نے مولانا مملوک علی، مولانا وجیہ الدین سہارنپوری اور مولانا شاہ محمد اسحاق سے پڑھا۔ تحصیلِ علم کے بعد کچھ عرصہ آپ تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ پھر آپ نے دہلی میں مطبع احمدیہ کے نام سے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا اور اس

میں قرآنِ عظیم اور حدیث کی کتابوں کو بڑی صحت کے ساتھ چھاپا۔ آپ اپنے عہد میں حدیثوں کے حافظ تھے۔ موصوف نے شیخ الاسلام محمد قاسم کے ساتھ مل کر صحیح بخاری پر حاشیے لکھے۔ اس کے علاوہ آپ نے حدیث کی اور بہت سی کتابوں کی ذیول (شرحیں) لکھیں، جن کی وجہ سے ملک کے اطراف میں علم حدیث کو بڑا فروغ ہوا۔ آپ سے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم اور ہمارے استاد حضرت شیخ الہند نے بھی استفادہ کیا۔ مولانا احمد علی نے ۱۲۹۷ھ میں انتقال فرمایا۔

(تمہید صفحہ ۲۲۶)۔

(۴۲) مولانا شیخ محمد تھانوی:

تھانہ بھون کے یہ بزرگ مولانا شیخ محمد تھانوی محدث کے نام سے مشہور ہیں آپ کی رائے ۱۸۵۷ء کی تحریکِ حریت کے خلاف تھی، مولانا حسین احمد صاحب صدر دیوبند نے ایک مرتبہ سہارنپور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ امیر امداد اللہ شیخ الاسلام محمد قاسم اور حضرت مولانا گنگوہی وغیرہ حضرات نے مولانا شیخ محمد کی مسجد میں جا کر جہاد حریت کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ مولانا شیخ محمد نے اہل ہند کی بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہاد کی مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ کیا ہم اصحابِ بدر سے بھی زیادہ کمزور ہیں؟ امیر امداد اللہ نے طرفین کی گفتگو سننے کے بعد فرمایا کہ الحمد للہ انشراح ہو گیا۔ اور واپس آ کر جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ امیر امداد اللہ نے امامت قبول کی۔ شیخ الاسلام نانوتوی سپہ سالار قرار پائے اور شیخ الاسلام گنگوہی قاضی مقرر ہوئے۔

اس طرح قصبہ تھانہ بھون ایک دار اسلام بنا لیا گیا۔ پھر پیش قدمی کر کے قصبہ شاملی ضلع مظفر نگر بھی فتح کر لیا۔

شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں، جن کے مسلک پر مولانا اشرف علیؒ کاربند ہیں، اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے ہیں۔ مولانا اشرف علی مرحوم کے سوانح حیات جو شائع ہو چکے ہیں، ان میں تصریح ہے کہ آپ مولانا شیخ محمد صاحب کے مسلک کے پیرو ہیں۔ مولانا شیخ محمد

اور امیر امداد اللہ ایک ہی مرشد کے خلیفہ ہیں۔ اسی مسئلہ جہاد پر آپس میں مخالف ہو گئے اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ اب امیر امداد اللہ کی جانشینی کا استحقاق مولانا اشرف علی صاحب کو کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی خطرناک استادی ہے جو مولانا شیخ الہند اور ان کے اساتذہ کے خصوصی کاموں کو بیکار بنا دینا چاہتی ہے۔

۴۳۔ مولانا محمود حسن :-

مولانا محمود حسن شیخ الہند میرے استاد تھے۔ دار العلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں میرا ان پر تمام تر اعتماد تھا۔ آپ کے والد کا نام ذوالفقار علی تھا۔ موصوف کا سلسلۂ نسب قریش کے اموی خاندان سے ملتا ہے۔ مولانا محمود حسن ۱۲۶۸ھ یا ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں آپ نے اپنے والد اور چچا سے پڑھیں۔ ۱۲۸۳ھ یا ۱۸۶۶ء میں جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد پڑی تو مولانا اس میں داخل ہوئے، اور مولانا محمد یعقوب بن مملوک علی اور مولانا محمود دیوبندی سے پڑھا۔ آپ شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم کی صحبت میں رہے، اور موصوف سے بہت استفادہ کیا۔ آپ نے مولانا احمد علی، شیخ محمد مظہر نانوتوی اور شیخ عبد الرحمٰن پانی پتی سے تدریس و تعلیم کی اجازت طلب کی۔ اور ان سب بزرگوں نے موصوف کو اس کام کا اہل پا کر اجازہ علمی سے مرحمت فرمایا۔

شیخ الاسلام محمد قاسم مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں مولانا عبد الغنی سے بھی مولانا محمود حسن کے لیے "اجازہ علمی" حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اپنے استاد مولانا محمد قاسم کی تعمیل ارشاد کرتے ہوئے آپ نے حاجی امداد اللہ سے اکتساب فیض کیا۔ جن بزرگوں نے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم سے علم حاصل کیا تھا۔ ان میں سے تین حضرات خاص طور پر مشہور اور ممتاز ہوئے۔ لیکن ان میں سے حضرت شیخ الہند کو اپنے استاد سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ وہ ان کے علوم پر سب سے زیادہ حاوی تھے۔ اور ان کے اتباع میں موصوف کو سب سے زیادہ شغف تھا۔ میں (مولانا سندھی)

سنے آپ سے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم کی کتاب "حجۃ الاسلام" پڑھی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی میں یوں محسوس کرتا جیسے علم اور ایمان میرے دل میں اوپر سے نازل ہو رہا ہے۔ حضرت شیخ الہند کی ذاتِ اقدس کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ وہ فطرتاً بڑے ذکی اور ذہین تھے۔ موصوف کا شمار ان بزرگوں میں سے ہو سکتا ہے، جنہیں امام ولی اللہؒ کی اصطلاح میں "مفہمین" کہا جاتا ہے۔ آپ اپنے استاد سے بڑی عقیدت رکھتے۔ اور ان کی متابعت میں ہر دم کوشاں رہتے۔ آپ کو شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم سے تواضع اور انکسار کی نسبت تھی۔ اسی نسبت کو امام ولی اللہؒ نے اپنی کتابوں میں "نسبت اہلِ بیت" کا نام دیا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو امام عبدالعزیز کی وفات کے پورے سو سال بعد انتقال فرمایا۔

ضمیمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ ط

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ط

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اِنَّ وَلِیِّ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ۝ ط

الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد سید المرسلین وخاتم النبیین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ ائمۃ الدین وعباد اللہ الصلحین وبارک وسلم۔

امابعد۔ آج ہم نے خدا کا نام لے کر اور اسی کی مدد پر اعتماد کر کے شمال مغربی ہند کی نئی سیاسی جماعت "جمنا و نربدا سندھ ساگر پارٹی" کے پہلے حصہ کا کام سندھ میں شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ پارٹی کے چند اساسی قواعد ہم نے ضبط کر لئے ہیں تاکہ خواص کو دعوت دینے میں آسانی ہو۔ ان میں اکثر وہی باتیں ہیں، جو سیاسی مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک علوم متعارفہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کی مزید تشریح کی اس مقدمہ میں ضرورت نہیں۔ البتہ پارٹی کے میدانِ عمل کو محدود کرنے کا مسئلہ قابلِ وضاحت ہے۔

جس مبصر کو گذشتہ تیس برس کی تاریخ پیشِ نظر ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تقدم اتنا مشکل نہیں، جیسا کہ اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا، لیکن اُس پر یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ کھیل جب کبھی بن کر بگڑتا ہے تو اس کی تہ میں ہندو مسلم اختلاف ہی باعث نظر آتا ہے۔

اس اختلاف کو حل کرنے کے لیے متفرق طور پر سیاسی نظریات بنائے گئے مگر عملاً ؎

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

کا منظر سامنے آتا ہے۔

ہم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے عملی اشتراک کے ساتھ ساتھ ان میں فکری اتحاد کا ضمیمہ بھی لگا دیا ہے۔ اس طرح ہم ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے اپنی تحریک کے لیے ایک ایسا قطعہ زمین انتخاب کیا ہے، جو دونوں تہذیبوں کا مرکز ہے۔

جس طرح گنگا جمنا کا دوآبہ ہندو تہذیب کا منبع ہے۔ اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے۔ اگر ہم ان دو عظیم الشان قطعات کا اپنے نظریہ پر سمجھوتہ کرا سکے، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی تالیف قلوب پر قادر ہو سکے تو اس لاینحل شکل کی کلید مل جائے گی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسکندریہ میں حکماء کا ایک طائفہ نو فلاطونی پیدا ہوا تھا۔ اسی منہاج پر مسلمانوں میں کئی حکیم پیدا ہوئے، جن میں سے الشیخ الاکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین السہروردی مشہور عالم ہیں۔

ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے صوفیۂ کرام کی آمد شروع ہوئی۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد اس خاک سے تصوف کے چاروں طریقوں میں کثرت سے معرفت الٰہی میں کامل خادم انسانیت پیدا ہوئے وہ سب اسی مسلک اشراقی کے امام تھے، مگر ایسا عالم جو اپنے انکشافات اور نظریات کی تدوین و تنظیم پر قادر ہو، امام ولی اللہؒ دہلوی جیسا پیدا نہیں ہوا۔

ان تمام ائمہ تصوف کا مرکزی فکر وحدت الوجود ہے، جو ویدانت فلاسفی کا اصل اصول ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے اسی کی تہذیب و تکمیل سے انسانیت کی تشریح کی اور اسی کو کتاب و سنت

کا بطل بنایا۔ جیسا کہ ان کی معرکۃ الآراء کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" اور ان کی فلسفی تصنیف "البدور البازغۃ" و "التفہیمات الالٰہیۃ" وغیرہ سے واضح ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں اگر ہندو اور مسلمان دونوں مذہبوں کے خدام انسانیت الٰہی فلاسفی کو اپنا امام بنا کر تقدم کی جد و جہد میں مصروف ہو جائیں تو ہند ایک دفعہ پھر مجمع البحرین بن کر دنیا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

ہمارے پرانے رفقاء میں سے اگر کوئی بزرگ ہمارا نیا انداز دیکھ کر چیں بہ جبیں ہوں تو ان کی خدمت میں مختصراً عرض ہے کہ ہمارا اصلی مخاطب ہندوستانی نوجوان ہے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پندِ پیر دانا را